مطالعہ علوم اسلامیہ
اردو ترجمہ
کتاب المعاقل و الوصایا
والخنثیٰ
من الهدایة
تصدرها:
المكتبة العلمية
للطباعة والنشر والتوزيع
۱۵ - لیک روڈ، لاہور
مغربی پاکستان

مطالعہ علوم اسلامیہ

اردو ترجمہ

كتاب المعاقل والوصايا والخنثى

من الهداية

پروفیسر غازی احمد

ایم۔ اے (عربی۔ گولڈ میڈلسٹ)
ایم۔ اے (علوم اسلامیہ گولڈ میڈلسٹ)
ایم۔ او۔ ایل، بی۔ ایڈ
مولوی فاضل (میڈلسٹ)
منشی فاضل، فاضل درس نظامی

ناشر:
المكتبة العلمية ۔ ۱۵ لیک روڈ ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتابُ المَعَاقِل

اہلِ معاقل کے بیان میں

(کتاب الدیات میں بیان کیا گیا تھا کہ عاقلہ یعنی مددگار برادری پر قتل خطاء کی صورت میں دیت کا بوجھ ڈالا جاتا ہے اور وہ تمام صورتیں بیان کی گئیں جن میں عاقلہ دیت کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس باب میں بتایا گیا ہے کہ عاقلہ کس برادری کو کہا جاتا ہے اور اس کے احکام کی تفصیلات کیا ہیں)

مصنفؒ فرماتے ہیں کہ معاقل کا مفرد مَعْقُلَة ہے۔ معقلہ دیت کو کہا جاتا ہے (اس کا مادہ عَقل ہے۔ بمعنی روکنا۔ منع کرنا چونکہ فہم وشعور بھی انسان کو بُرے کاموں سے روکتا ہے اس لیے اسے عقل کا نام دیا جاتا ہے۔ عِقَال وہ رسی جو اہلِ عرب رومال پر باندھتے ہیں یا جانور کا دودھ دوہتے وقت اس کی پچھلی ٹانگوں سے جو رسی باندھی جاتی ہے اُسے بھی عِقال کہتے ہیں) دیت کو عقل اس لیے

کہا جاتا ہے کہ دیت خون کو بہانے سے روکتی ہے۔ تَعَقّل بمعنی تَمَسُّک
یعنی روکتی ہے۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا۔ قتل شبہ عمد اور قتل خطاء کی
دیت اور ہر وہ دیت جو قتل نفس سے واجب ہو عاقلہ کے ذمے
عائد ہوتی ہے اور عاقلہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو دیت کی ادائیگی کرتے
ہیں۔ کیونکہ عقل سے مراد دیت ہے یہ بات ہم کتاب الدیات
میں بیان کر چکے ہیں۔

عاقلہ پر دیت کے وجوب کی اصل اور بنیاد حدیث حمل بن مالک
رضی اللہ عنہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو آپ نے
مجرم کے اولیاء کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا اٹھو اور دیت ادا کرو۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسانی جان ایک محترم و مکرم چیز ہے اسے
نظر انداز کرنے اور رائیگاں چھوڑنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اور خطاً قتل
کرنے والا معذور ہے (کیونکہ اس نے قصد و ارادے سے قتل کا
ارتکاب نہیں کیا) نیز شبہ عمد کے قتل کے مرتکب کو بھی معذور سمجھا
جاتا ہے آلہ قتل پر نظر ڈالتے ہوئے (یعنی اس نے جو آلہ استعمال
کیا ہے وہ قتل کے لیے موضوع نہیں۔ ممکن ہے اس نے تنبیہ
و تادیب کے پیش نظر اس آلے سے مارا ہو اور اتفاقاً موت واقع
ہو گئی ہو) لہٰذا شبہ عمد کی صورت میں پوری سزا یعنی قصاص واجب
کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اور اس پر گراں قدر مال کے بوجھ ڈالنے

کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ مالی لحاظ سے تباہ و برباد ہو جائے گا اور نوبت
اس کے افلاس تک جا پہنچے گی۔ اور یہ مکمل سزا ہوگی (حالانکہ وہ مکمل
سزا کا مستحق نہ تھا) لہٰذا اس بوجھ کے برداشت کرنے میں ساتھ برادری
کو شامل کر لیا گیا تاکہ سزا میں کسی حد تک تخفیف کی صورت پیدا ہو سکے۔
برادری کو ساتھ اس لیے شامل کیا گیا کہ مجرم نے جرم کا ارتکاب غالباً
برادری کی قوت و طاقت — جو اسے حاصل تھی — کے بل بوتے پر
کیا ہے۔ کیونکہ انسان کے حقیقی مددگار تو برادری کے افراد ہی ہیں
لہٰذا مجرم کی نگہداشت کے سلسلے میں پہلوتہی کرنے کی بناء پر برادری کو
مجرم کے ساتھ شامل کرنے میں مختص کیا گیا اور عاقلہ کو ساتھ شامل کر لیا گیا۔

مسئلہ: امام قدوری نے فرمایا اگر قاتل اہل دیوان میں سے ہو تو اس
کی عاقلہ اہلِ دیوان ہی ہوں گے۔ ان کی تنخواہوں اور وظائف میں سے
تین سال کی مدت میں دیت کی تکمیل کی جائے گی۔ اہلِ دیوان سے مراد
لشکر کے وہ لوگ ہیں جن کے نام رجسٹروں میں مکتوب ہیں۔ یہ حکم
ہمارے نزدیک ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ دیت قاتل کے قبیلہ
پر ہوگی۔ کیونکہ عہدِ رسالت میں اسی پر عمل تھا اور آپ کے بعد کسی نسخ
کا امکان باقی نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس طرح مل جل کر دیت ادا کرنا ایک نوع
کی صلہ رحمی ہے۔ اور اس کے اعزہ و اقارب ہی اولیٰ ہیں۔

ہماری دلیل حضرت فاروقؓ کا فیصلہ ہے جب آپ نے دیوان اور

رجسٹر مرتب فرمائے تو دیت کو اہل دیوان پر لازم کیا اور یہ سب کچھ صحابہ کرام
کی موجودگی میں کیا گیا اور صحابہ میں کسی نے کوئی اعتراض نہ کیا حضرت عمرؓ
کا یہ فیصلہ نسخ کا درجہ نہیں رکھتا بلکہ معنوی طور پر یہ عاقلہ کے مفہوم کو پختہ
کرتا ہے۔ کیونکہ دیت کی ادائیگی قاتل کے اعوان و انصار پر واجب ہوتی
ہے اور نصرت کئی طریقوں سے حاصل ہوتی ہے مثلاً رشتہ داری
کے ذریعے سے۔ باہمی تعاون نصرت کے وعدے اور حلف سے۔ ولاء
یعنی غلام آزاد کرنے سے اور کسی گروہ کے شمار میں آجانے کی وجہ سے
(یعنی ایک شخص دوسری قوم سے معاہدہ کرلے اور دکھ سکھ میں ان کے
ساتھ شریک ہو جائے) اور حضرت فاروقؓ کے عہد میں باہمی نصرت دیوان
کی وجہ سے ہو گئی تو آپ نے عاقلہ کے معانی کے پیش نظر دیت کو اہل دیوان
پر لازم کر دیا۔ اسی بناء پر (یعنی معنی کا لحاظ کرتے ہوئے) مشائخ نے فرمایا
کہ اگر آج کسی قوم کی باہمی نصرت حرفہ و پیشہ کی بناء پر ہو تو یہ اہل پیشہ ہی
عاقلہ ہوں گے۔ اگر باہمی نصرت حلف و معاہدہ کی وجہ سے ہو تو اس کی
عاقلہ وہی لوگ ہیں جو معاہدہ کی وجہ سے باہم پیوستہ ہیں۔

ہم آپ کی بات تسلیم کرتے ہیں کہ دیت ایک قسم کی صلہ رحمی اور
احسان ہے لیکن اس کو ایسے مال پر واجب کرنا زیادہ مناسب ہے جو
بطور تبرع و احسان ہو اور ایسا مال وظائف و تنخواہیں ہیں بہ نسبت ان
اموال کے جو انسان کا اصل سرمایہ ہیں (اور طویل عرصہ کی محنت کے بعد
حاصل کیے گئے ہیں) تین سال کی مدت کا اندازہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

سے مروی ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سالانہ وظیفہ سے دیت کی وصولی میں تخفیف کا پہلو مدِ نظر ہے اور وظیفہ سال میں ایک مرتبہ ملتا ہے (لہٰذا تین سالوں میں دیت کی وصولی میں سہولت کو مدِ نظر رکھا گیا ہے)۔

اگر یہ وظائف تین سال سے زائد عرصہ یا اس سے کم مدت میں حاصل کیے جائیں تو دیت بھی اسی حساب سے واجب الاداء ہو گی۔ (مثلاً وظائف تین سال میں وصول ہوتے ہیں تو ہر سال کے وظیفہ سے دیت کی تہائی وصول کی جائے گی۔ اگر وظائف چار سالوں میں وصول ہوتے ہیں تو دیت کی چوتھائی ہر سال کے وظائف سے لی جائے گی) کیونکہ اس طرح مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ وظائف فیصلہ کے بعد آئندہ آنے والے سالوں کے لیے ہوں حتیٰ کہ اگر یہ عطیات فیصلہ سے پہلے گزشتہ سالوں کے جمع کیے ہوتے ہوں اور پھر یہ فیصلہ کے بعد ملیں تو ان سے دیت کے سلسلے میں کوئی چیز نہ لی جائے گی کیونکہ دیت کا وجوب فیصلے کی وجہ سے ہوا ہے جیسا کہ ان شاء اللہ ہم آئندہ سطور میں بیان کریں گے (اس لیے جو رقوم فیصلہ نافذ ہونے سے متقدم ہیں ان سے بحق دیت کچھ نہ لیا جائے گا)۔

اگر قاتل کے لیے تین سال آئندہ کے وظائف (فیصلہ کے بعد) ایک ہی سال میں نکل آئے۔ (یعنی یہ عطیات گزشتہ سالوں کے نہ ہوں بلکہ آئندہ سالوں کے ہوں) تو ان عطیات سے پوری دیت وصول کر لی جائے گی

جیسا کہ ہم نے بتایا ہے۔

جب پوری دیت کی ادائیگی تین سال کے عرصے میں واجب ہے تو دیت کا ایک تہائی ہر سال لیا جائے گا۔ اگر واجب ہونے والا تاوان نفس کی دیت کی تہائی یا اس سے کم ہو تو اس کی ادائیگی ایک سال میں واجب ہوگی اور جو رقم تہائی سے زائد ہو دو تہائی کی مقدار تک تو وہ دوسرے سال میں وصول کی جائے گی اور جو رقم دو تہائی سے زائد ہو مکمل دیت کی مقدار تک اس کی وصولی تیسرے سال میں کی جائے گی۔

اور جو دیت عاقلہ پر واجب ہو یا خود قاتل پر واجب ہو مثلاً باپ نے بیٹے کو عمداً قتل کر دیا تو دیت باپ کے مال میں ہوگی اس کی ادائیگی کے لیے بھی تین سال کی مدت ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جو دیت قاتل پر اس کے مال سے واجب ہو اس کی ادائیگی فی الحال ہوگی۔ کیونکہ تین سال کی میعاد تو اس صورت میں دی جاتی ہے جب کہ دیت عاقلہ کے ذمے واجب الاداء ہو لہٰذا عمد محض کے قتل کے تاوان کو اس کے ساتھ لاحق نہیں کیا جائے گا۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ قیاس تو اس امر سے انکار کرتا ہے کہ جان کے بدلے میں مال لیا جائے۔ لیکن حکم شریعت اس بارے میں مؤجل وارد ہوا ہے (کہ دیت تین سال کی مدت میں ادا کی جائے) تو حکم منصوص سے آگے کسی اور بات کی طرف تجاوز نہیں کیا جائے گا۔

اگر دس آدمیوں نے ایک شخص کو خطأً قتل کر دیا تو ہر آدمی پر تین

سال کی مدت میں دیت کا دسواں حصہ ادا کرنا واجب ہوگا۔ جزء کو کل پر قیاس کرتے ہوئے کیونکہ یہ دیت نفس کا بدلہ ہے (یعنی جس طرح کل دیت کی ادائیگی تین سال میں ہوتی ہے اسی طرح دیت کے کسی جزء کی ادائیگی بھی تین سال میں ہوگی)۔

تین سال کی مدت کا آغاز اس وقت سے ہوگا جب کہ دیت کے بارے میں فیصلہ کر دیا گیا کیونکہ قتل نفس میں اصل واجب تو اس کی مثل تھی اور قیمت کی طرف انتقال قاضی کے فیصلے کی وجہ سے کیا گیا تو مدت کے آغاز کا اعتبار بھی وقت فیصلہ سے ہوگا جیسا کہ ولد مغرور کے سلسلے میں ہوتا ہے (کہ اس کی قیمت فیصلہ کے وقت سے مقرر کی جاتی ہے۔)

مسئلہ:۔ امام قدوری نے فرمایا اگر قاتل اہل دیوان سے نہ ہو تو اس کی عاقلہ اس کا قبیلہ ہے کیونکہ وہ اپنے قبیلے کے افراد ہی سے نصرت حاصل کرتا ہے اور یہی نصرت عاقلہ کے سلسلے میں قابل اعتبار ہے۔

مسئلہ:۔ امام قدوری نے فرمایا اور اہل قبیلہ پر دیت تین سالوں کے لحاظ سے تقسیم کی جائے گی بایں طور کہ ایک شخص پر ایک سال میں چار درہم سے زیادہ مقرر نہیں کیے جائیں گے۔ ہاں اس سے کمی ممکن ہے۔

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ امام قدوری نے اپنی مختصر میں اسی طرح ذکر کیا ہے اور اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ پوری دیت میں چار درہم سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔

امام محمد نے اس بات کو صراحت سے بیان کیا ہے کہ ہر ایک پر

پوری دیت سے۔ جو تین سال میں واجب الادا ہے۔ تین یا چار درہم پر اضافہ نہیں کیا جائے گا تو ہر شخص سے ہر سال میں ایک درہم یا ایک درہم اور تہائی (یعنی ۱⅓) درہم وصول کیا جائے گا اور یہی صحیح تر قول ہے۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا اگر قاتل کے قبیلہ میں دیت کی ادائگی کی وسعت نہ ہو تو ان لوگوں کے قریب ترین قبیلہ کو بھی ساتھ شامل کر لیا جائے گا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں سے جو قبیلہ حسب و نسب میں قریب ہے۔ یہ بات تخفیف اور سہولت کے مدنظر کی جائے گی۔ اور عصبات کی ترتیب کے مطابق پہلے سب سے اقرب کو شامل کیا جائے گا اس کے بعد دوسرے قریبی کو۔ سب سے پہلے بھائی پھر بھائیوں کے بیٹے۔ پھر چچا پھر ان کے بیٹے۔ قبائل کے آباء و ابناء کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ بھی نسب میں قرب کی وجہ سے داخل ہوں گے۔ بعض حضرات نے فرمایا کہ وہ داخل نہ ہوں گے کیونکہ قبائل کا اس طرح شامل کرنا کسی مشقت اور حرج کے ازالے کے لیے ہوتا ہے تاکہ ہر شخص پر تین یا چار درہموں سے زیادہ بوجھ نہ پڑے اور سہولت و تخفیف کا یہ پہلو اس صورت میں بھی متحقق ہو جاتا ہے جب کہ افرادِ قبیلہ کثرت سے ہوں۔ جہاں تک حقیقی باپ اور اس کی اولاد کا تعلق ہے عموماً آباء و ابناء کی کثرت نہیں ہوتی اس لیے انھیں شامل کرنا ضروری نہ ہوگا۔

اسی اصول کے مطابق اہل دیوان کا حکم ہوگا کہ جب ایک جھنڈے تلے جمع ہونے والے افراد میں دیت کی ادائیگی کی وسعت نہ ہو تو

ان سے قریب تر جھنڈے تلے جمع ہونے والوں کو ساتھ شامل کر لیا جائے گا یعنی جو نصرت و تعاون کے لحاظ سے ان سے قریب ہیں جب کہ انھیں کوئی دشواری یا دقت پیش آئے تو قریبی تعاون والوں کو ساتھ ملایا جائے گا) اس چیز کا صحیح فیصلہ کرنا امام کے سپرد کیا جائے گا کیونکہ وہی اس امر سے آگاہ ہے (کہ کون سے جھنڈے والے کس کے قریب ہیں) یہ تمام احکام علماء احناف کے نزدیک ہیں۔ امام شافعیؒ کے نزدیک ہر شخص پر نصف دینار واجب ہوگا اور تمام افرادِ قبیلہ کی حیثیت مساوی ہوگی (خواہ آباء ہوں یا ابناء) کیونکہ یہ صلہ رحمی کی ایک صورت ہے اسے زکوٰۃ پر قیاس کیا جائے گا اور زکوٰۃ کی کم از کم مقدار نصف دینار ہے کیونکہ صحابہ کرام پانچ دراہم کو نصف دینار شمار فرماتے تھے۔

ہم امام شافعیؒ کے جواب میں کہتے ہیں کہ دیت کو زکوٰۃ پر قیاس نہیں کیا جائے گا کیونکہ دیت رتبے میں زکوٰۃ سے کم تر ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ دیت اصل مال سے نہیں لی جاتی۔ لیکن زکوٰۃ اصل مال سے لی جاتی ہے۔ لہٰذا دیت کی مقدار زکوٰۃ سے کم رکھی جائے گی تاکہ مزید تخفیف و سہولت کے معانی متحقق ہو سکیں۔

مسئلہ: اگر قاتل کی برادری کے افراد ایسے لوگ ہیں جو بیت المال سے وظیفہ لیتے ہیں تو دیت کا فیصلہ ان کے وظائف سے تین سال کی مدت میں کیا جائے گا کہ ہر سال ایک تہائی ادا کریں۔ کیونکہ ان کے حق میں یہ وظیفہ بمنزلۂ عطاء کے ہے۔ کیونکہ وظیفہ و عطاء میں سے

ہر چیز بیت المال کی طرف سے صلہ رحمی ہے۔ پھر دیکھا جائے گا کہ اگر ان کے وظائف ہر سال بیت المال سے ادا کیے جاتے ہیں تو یونہی ان وظائف کی ادائیگی ہوگی ان سے دیت کی ایک تہائی وصول کر لی جائے گی جیسا کہ عطا سے وصول کی جاتی ہے۔ اگر وظیفے کی ادائیگی ششماہی کی جاتی ہے اور یہ ششماہی ادائیگی قاضی کے فیصلے کے بعد ہوگی تو وظائف سے دیت کا چھٹا حصہ وصول کیا جائے گا۔ اگر وظائف کی ادائیگی ماہانہ ہوتی ہے تو ہر وظیفے سے ماہانہ حصے کے مطابق لیا جائے گا" تاکہ سال میں وصول کردہ رقم دیت کی تہائی کے برابر ہو جائے۔

اگر وظیفہ قاضی کے فیصلے کے ایک دو روز بعد تقسیم کیا گیا تو اس ماہ کے وظیفے سے مہینے کے حصے کے مطابق لے لیا جائے گا۔ اگر ان لوگوں کو ماہانہ وظائف ملتے ہوں اور سالانہ عطیات بھی ملتے ہوں تو دیت عطیات میں مقرر کی جائے گی وظائف میں نہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کے لیے اس میں آسانی ہے اس لیے کہ عطیات وظائف کی بہ نسبت زیادہ ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ وظائف تو وقتی ضروریات کی کفالت کے لیے بقدر ضرورت و کفایت ملتے ہیں لہٰذا وظائف سے دیت کی ادائیگی مشکل ہوگی۔ اور عطیات سالانہ انعامات ہیں جو مجاہدین کو اس لیے دیے جاتے ہیں کہ وہ نصرت و اعانت کے لیے دیوان میں مندرج ہونے کی حیثیت سے "قائم و دائم" رہیں تو ان کے لیے عطیات سے دین کا ادا کرنا آسان ہوگا۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا۔ دیت کی ادائیگی میں قاتل بھی عاقلہ کے ساتھ شامل ہوگا۔ اور دیت کی ادائیگی میں وہ بھی ان میں سے ایک فرد کی طرح ہوگا۔ کیونکہ فاعل تو فی الحقیقت یہی قاتل ہے لہٰذا اس کے کوئی معنی نہ ہوں گے کہ اسے تو ادائیگی سے خارج کر دیا جائے اور دوسروں سے مواخذہ کیا جائے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ دیت کے سلسلے میں قاتل پر کچھ بھی واجب نہ ہوگا۔ کیونکہ جب کل دیت کی اس سے نفی ہو چکی ہے تو جزء کو کل پر قیاس کرتے ہوئے جز کی نفی بھی ہو جائے گی اور اس قیاس کی جامعہ علت قاتل کا معذور ہونا ہے۔

ہم جواب میں کہتے ہیں کہ قاتل پر ساری دیت واجب کرنے میں اس کی مالی تباہی ہے لیکن دیت کا ایک حصہ واجب کرنے میں اس قسم کی دشواری پیش نہیں آتی۔ اور اگر خطا کار معذور ہے تو وہ لوگ (عاقلہ) بدرجہ اولیٰ معذور رہیں گے جو خطا سے بالکل بری ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ کوئی گناہگار کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

مسئلہ:۔ ان عورتوں اور بچوں پر دیت واجب نہ ہوگی جن کو دیوان سے کچھ بطور وظیفہ ملتا ہو۔ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کا ارشاد گرامی ہے کہ عاقلہ برادری کے ساتھ کوئی عورت یا بچہ دیت ادا نہیں کرے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ دیت اہل نصرت پر اس لیے واجب ہوتی

ہے کہ انہی کی نگہداشت میں کوتاہی سے کام لیا گیا ہے۔ لوگ بچوں اور عورتوں کے ذریعے مدد و نصرت حاصل نہیں کیا کرتے لہٰذا جو چیز نصرت کے قائم مقام ہے یعنی جزیہ وہ بھی عورتوں اور بچوں پر عائد نہیں کیا جاتا۔ اسی بناء پر اگر قاتل عورت یا بچہ ہو تو ان پر دیت سے کچھ بھی لازم نہ کیا جائے گا۔ بخلاف مرد کے کہ وہ دیت کی ادائیگی میں عاقلہ کے ساتھ شریک ہوتا ہے کیونکہ اس پر دیت کے ایک حصے کا وجوب اس لیے ہوتا ہے کہ وہ بھی عاقلہ برادری کا ایک فرد ہوتا ہے اور وہ اپنی ذات اور نفس کا مددگار ہے لیکن یہ بات بچے اور عورت میں نہیں پائی جاتی۔ بیت المال سے جو عطیات عورتوں اور بچوں کو ملتے ہیں وہ ان کی نصرت کے معاوضے میں نہیں ملتے بلکہ ان عطیات سے ان کی مدد مقصود ہوتی ہے جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ازواج مطہرات کے لیے مقرر تھے۔

مسئلہ:۔ ایک شہر والے دوسرے شہر والوں کے لیے عاقلہ نہ ہوں گے۔ مصنف فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہر شہر والوں کے دیوانِ جہاد علیحدہ علیحدہ ہوں۔ کیونکہ دفتر میں اندراج ہونے کی صورت میں باہمی نصرت دیوان میں شرکت کی بناء پر ہوتی ہے۔ اگر باہمی نصرت سکونت کے قرب کی وجہ سے ہو تو قاتل کے شہر کے لوگ دوسرے شہر کے باشندوں کی نسبت اس سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔

مسئلہ:۔ ہر شہر والے مضافات اور ملحقہ دیہات والوں کے لیے مددگار

برادری ہوں گے۔ (یعنی جب کسی ساتھ والے گاؤں میں کسی سے خطأً قتل ہو جائے اور گاؤں والوں میں دیت کے ادا کرنے کی گنجائش نہ ہو تو ملحقہ شہر والے ان کی طرف سے دیت ادا کریں گے) کیونکہ گاؤں والے اہل شہر کے تابع ہوتے ہیں اس لیے جب گاؤں والے کسی مشکل میں پھنس جائیں تو وہ اہلِ شہر سے مدد کے طالب ہوتے ہیں لہٰذا اہلِ شہر اسی قرب اور نصرت کے معنی کے پیشِ نظر اہلِ دِہ کی دیت ادا کریں گے۔

مسئلہ: جس شخص کا مکان بصرہ میں ہو اور دیوان کوفہ میں ہو (یعنی اس کا نام کوفہ والوں کے ساتھ رجسٹر میں درج ہو) تو اہلِ کوفہ اس کی طرف سے دیت کی ادائیگی کریں گے کیونکہ وہ اپنے اہلِ دیوان سے نصرت کا طالب ہوتا ہے نہ کہ اپنے پڑوسیوں سے۔ الحاصل اہلِ دیوان سے نصرت کا طالب ہونا اظہر ہے لہٰذا دیوان کے موجود ہونے کی صورت میں قرابت نسب، وِلاء اور قرب مسکن کے ذریعے حاصل ہونے والی نصرت کا حکم ظاہر نہ ہوگا۔ دیوان کے بعد نسب کے ذریعے نصرت حاصل کرنے کا درجہ ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اس اصول پر دین کے بہت سے مسائل متفرع ہوتے ہیں۔

مسئلہ: اگر اہلِ شہر میں سے کسی نے جرم کا ارتکاب کیا اور دیوان میں اس کے لیے کوئی عطیہ نہیں اور ملحقہ گاؤں والے نسب کے لحاظ سے اس سے زیادہ قریب ہیں لیکن مجرم کا مکان شہر میں ہے تو اس شہر کے اہلِ دیوان اس کی طرف سے دیت ادا کریں گے۔ امام محمدؒ نے یہ شرط عائد

نہیں کی کہ مجرم اور اہلِ دیوان میں کوئی قرابت ہو۔ بعض حضرات کے نزدیک یہی صحیح ہے (کہ قرابت کے بغیر بھی اہلِ دیوان اس کے عاقلہ ہوں گے) کیونکہ جو لوگ اہلِ شہر کی طرف سے مدافعت کرتے ہیں اور ان کی نصرت کے لیے کمربستہ رہتے ہیں وہ اس شہر کے اہلِ دیوان ہی تو ہیں۔ اس مدافعت کے ساتھ اہلِ عطیات کی خصوصیت نہیں بلکہ وہ تو ہر شخص سے مدافعت کرتے ہیں۔

بعض مشائخ کے نزدیک اس مسئلہ کی تاویل یہ ہے کہ اہلِ دیوان اس مجرم کے لیے اسی صورت میں عاقلہ ہوں گے کہ اس کو اہلِ دیوان کے ساتھ قرابت ہو اور کتاب میں بھی اسی جانب اشارہ ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ اہلِ دیہہ قاتل سے نسبی لحاظ سے زیادہ قریب ہوں بہ نسبت اہلِ شہر کے (یعنی اگرچہ شہر والوں کی بھی قرابت ہے مگر اہلِ دیہہ کی قرابت زیادہ ہے) اس تاویل کی وجہ یہ ہے کہ دیت کا وجوب ان پر بحکم قرابت ہے اور اہلِ شہر کو مکان و سکونت کے لحاظ سے اہلِ بادیہ کی نسبت سے زیادہ قرب حاصل ہے تو نصرت پر قدرت بھی اہلِ شہر کو ہی حاصل ہوگی۔ یہ مسئلہ غیبتِ منقطعہ کی نظیر ہوگا (ایک لڑکی کے دو ولی ہوں۔ ولیِ اقرب کے بارے میں کچھ علم نہیں کہ وہ کہاں ہے ولی ابعد موجود ہے۔ جب ولیِ اقرب کی آمد کی کوئی امید نہ ہو تو ولیِ ابعد کو لڑکی کے نکاح اور اس کے مصالح کی سرپرستی حاصل ہوگی)۔

مسئلہ:- اگر ایک دیہاتی شہر میں اقامت پذیر ہو لیکن شہر میں اس

کا مکان نہ ہو تو اہلِ شہر اس کی عاقلہ نہ ہوں گے۔ کیونکہ اہلِ شہر میں سے اہلِ عطاء اس شخص کی نصرت نہیں کرتے جس کا مکان وہاں نہ ہو جیسا کہ اہلِ دیہہ اس شہری کی طرف سے دیت ادا نہیں کرتے جو ان میں صرف اقامت پذیر ہو (اور اس کا مکان وہاں نہ ہو) کیونکہ شہری ان سے نصرت کا مطالبہ نہیں کرتا۔

مسئلہ:- اگر ذمیوں کے لیے معروف برادریاں ہوں جو باہمی طور پر ایک دوسرے کی مدد کرتی ہوں۔ اہلِ ذمہ میں سے ایک شخص نے کسی کو خطاً قتل کر دیا تو اس کی دیت عاقلہ پر ہوگی جیسے مسلمان کے معاملے میں ہوتا ہے۔ کیونکہ معاملات کے سلسلے میں اہلِ ذمہ نے اسلامی احکام کا التزام کیا ہوا ہے خصوصاً ان معاملات میں جن میں ضرر و نقصان سے بچاؤ مقصود ہوتا ہے اور باہمی نصرت و تعاون کے معنی ان کے حق میں موجود ہیں۔

اگر اہلِ ذمہ کی معروف برادری نہ ہو تو مقتول کی دیت قاتل کے مال میں ہوگی جو تین سال کی مدت میں ادا کی جائے گی۔ اس دن سے ابتداء کرتے ہوئے جس دن سے قاتل پر وجوب دیت کا فیصلہ کیا گیا۔ جیسا کہ مسلمان کے حق میں ہوتا ہے۔ اسی دلیل کے پیشِ نظر جو ہم نے بیان کی ہے کہ دراصل دیت کا وجوب، قاتل پر ہوتا ہے اور جب قاتل کی مددگار برادری موجود ہو تو یہ دیت قاتل سے منتقل ہو کر عاقلہ پر واجب ہو جاتی ہے۔ لیکن جب قاتل کی برادری ہی موجود نہ ہو تو دیت قاتل کے مال میں ہی واجب رہے گی۔ جیسے کہ وہ مسلمان تاجر دارالحرب میں

رہوں ان میں سے ایک دوسرے کو قتل کر دے تو دیت کا فیصلہ قاتل
کے مال سے کیا جائے گا کیونکہ دارالاسلام کے باشندے اس قاتل کے
مددگار نہیں ہو سکتے اور نہ قاتل کا یہ قتل اس کی برادری کی قوت، یا غلبہ کی بنا
پر نہیں ہے (کیونکہ برادری تو وہاں موجود ہی نہیں)۔

نہ تو مسلمان کی طرف سے کافر عاقلہ ہوتا ہے اور نہ کافر کی طرف سے
مسلمان عاقلہ ہوتا ہے کیونکہ ان میں باہمی نصرت نہیں ہوتی اور کفار اگرچہ
ان کی ملتیں مختلف ہوں باہمی طور پر ایک دوسرے کے مددگار ہوتے
ہیں۔ کیونکہ کفر ایک ہی ملت ہے۔

مشائخ نے فرمایا کہ یہ حکم کہ تمام کفار ایک دوسرے کے عاقلہ ہیں۔ اس
صورت میں ہے جب کہ ان کے درمیان عداوت ظاہر نہ ہو لیکن جب
ان میں عداوت واضح طور پر پائی جائے جیسے یہود و نصاریٰ تو مناسب
یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے عاقلہ نہ ہوں۔ امام ابو یوسف سے
بھی یہی مروی ہے کیونکہ ان میں باہمی نصرت منقطع ہوتی ہے۔

اگر قاتل اہل کوفہ سے ہو اور اس کا عطیہ و دیوان بھی کوفہ ہی میں ہو
لیکن اس کے قتل کرنے کے بعد دیوان کو بصرہ میں منتقل کر دیا جائے
پھر قتل کا مقدمہ قاضی کی عدالت میں پیش کیا گیا تو قاضی اس کی
اہل بصرہ والی برادری پر دیت کا فیصلہ کرے گا۔ امام زفر نے
فرمایا کہ اہل کوفہ والی عاقلہ پر دیت کا فیصلہ کیا جائے گا۔ امام ابو یوسف
سے بھی یہی روایت ہے۔ کیونکہ دیت کا موجب جنایت ہے اور

اس جنایت کا وقوع اس وقت ہوا جب کہ اہل کوفہ اس کی عاقلہ تھی۔ اور یہ صورت یوں ہوئی گویا کہ اس کا دیوان قضاءِ قاضی کے بعد منتقل کیا گیا (تو اس میں اہل کوفہ والی عاقلہ پر دیت ہوگی)

ہماری دلیل یہ ہے کہ مالِ دیت کا وجوب قضاءِ قاضی کے بعد ہوتا ہے جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ قتل کا اصل واجب تو قتل یعنی قصاص ہے لیکن قضاءِ قاضی کی بنا پر یہ واجب مال کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دیت کا اصلی وجوب تو قاتل پر ہے اور عاقلہ اس کی طرف سے برداشت کرتی ہے جب یہ بات ثابت ہو گئی تو تو اس کی طرف سے دیت کی متحمل وہ عاقلہ ہوگی جو قضاء کے وقت ہے بخلاف اس کے اگر قضاءِ قاضی کے بعد اس کا دیوان منتقل ہوا تو اہل کوفہ ہی اس کے عاقلہ ہوں گے کیونکہ قضاءِ قاضی سے اہل کوفہ پر اس کا وجوب متقرر ہو چکا ہے۔ اس لیے اس کے بعد اہل بصرہ کی طرف منتقل نہ ہوگا لیکن قاتل کا حصہ اس عطیہ سے لیا جائے گا جو اسے بصرہ میں ملے گا۔ کیونکہ دیت عطیہ سے وصول کی جاتی ہے اور اس کا عطیہ بصرہ میں ہے۔

یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ اہل کوفہ اداءِ دیت کے لیے کافی ہوں۔ بخلاف اس کے اگر حکم قضاء کے بعد عاقلہ کے افراد تھوڑے رہ جائیں (مثلاً کافی لوگ وفات پا جائیں) تو اس صورت میں نسب کے لحاظ سے جو قبیلہ ان کے قریب تر ہوگا ان کے ساتھ شامل کیا جائے گا

کیونکہ منتقل کر دینے میں پہلے حکم اور فیصلہ کا ابطال لازم آتا ہے اور
یہ کسی حال میں جائز نہیں۔ اور ملا دینے کی صورت میں فیصلہ شدہ دیت
کے تحمل کرنے والوں میں کثرت ہو جاتی ہے۔ اور اس ضم کرنے میں حکم
اول میں مزید استحکام پیدا ہو جاتا ہے اس کا ابطال لازم نہیں آتا۔

اسی اصول کی بناء پر اگر قاتل کی جائے سکونت کوفہ میں ہو اور کوفہ
میں اس کا عطیہ نہ ہو لیکن ابھی تک قاتل کے خلاف دیت کا فیصلہ
نہیں کیا گیا تھا کہ اس نے بصرہ کو اپنا وطن بنا لیا تو دیت کا حکم اہل بصرہ
پر دیا جائے گا۔ اور اگر اہل کوفہ پر دیت کا حکم دیا جا چکا ہو تو دیت
اہل بصرہ کی طرف منتقل نہ ہو گی۔

اسی طرح اگر دیہاتی کا نام دیوان مجاہدین میں درج کر لیا گیا حالانکہ
وہ قتل خطا کا ارتکاب کر چکا ہے لیکن ابھی قاضی نے دیت کا فیصلہ
نہیں دیا تو اب اہل دیوان پر دیت کا حکم ہو گا۔ اور اگر گاؤں والی اس
کی برادری پر دیت کا فیصلہ ہو چکا ہو تو گاؤں والوں سے دیت منتقل
نہ ہو گی۔

یہ عدم انتقال کا حکم اس صورت کے خلاف ہے کہ جب اہل دیہ
میں سے کسی قوم پر تین سالوں کے عرصے میں دیت دینے کا فیصلہ
ان کے مالوں سے کر دیا گیا ہو پھر امام نے انھیں اہل عطاء میں شامل کر
لیا تو اس صورت میں دیت ان کے عطیات کی طرف منتقل ہو جائے گی
اگرچہ پہلے ان کے مالوں سے دیت کی ادائیگی کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

کیونکہ اس صورت سے قضاءِ اوّل کے حکم کا ابطال نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ فیصلے کا تعلق ان کے اموال سے ہے اور عطیات بھی مال ہیں۔ البتہ اتنی بات ہے کہ دیت کی ادائیگی ایسے اموال سے واجب ہوتی ہے جن سے ادا کرنے میں سہولت ہو۔ اور عطیات سے ادا کرنا آسان تر ہے جب کہ یہ لوگ اہلِ عطاء میں شامل کر دیے گئے ہیں۔

البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اگر اموالِ عطیات اس جنس سے نہ ہوں جس کے ادا کرنے کا ان پر فیصلہ کیا گیا ہے۔ بایں طور کہ دیت کا فیصلہ اونٹوں کی ادائیگی سے کیا گیا اور عطیہ دراہم کی جنس سے ہے تو ایسی صورت میں مذکورہ حکم درہموں کی جانب کبھی منتقل نہ ہوگا۔ کیونکہ اس سے حکمِ اوّل کا ابطال لازم آتا ہے۔ الغرض اگر مالِ عطاء اور مالِ دیت کی جنس متحد ہو تو دیت کی ادائیگی عطیات کے مال سے ہوگی کیونکہ اس میں زیادہ سہولت ہے

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا۔ آزاد کردہ غلام کی برادری اس کے آقا کا قبیلہ ہے۔ کیونکہ نصرت انہی سے حاصل ہوتی ہے۔ نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ قوم کا آزاد کردہ غلام انھیں میں سے ہوتا ہے۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا اور جس شخص نے کسی قوم سے موالات کر لی ہو تو اس کی برادری آقا اور اس کا قبیلہ ہوگا کیونکہ یہ بھی ایسی ولاء ہے جس سے باہمی مدد حاصل ہوتی ہے تو یہ ولاءِ عتاقہ

یعنی آزادی کے مشابہ ہوگا۔ اس سے امام شافعیؒ کو اختلاف ہے یہ مسئلہ ولاء کے ضمن میں تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا کہ عاقلہ دیت کے دسویں حصے کے نصف سے کم میں مددگاری نہیں کرتی۔ دسویں حصے کے نصف یا اس سے زائد حصے میں مددگار ہوتی ہے۔ اس بارے میں اصل حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جو موقوف اور مرفوع دونوں طریق سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ مددگار برادری نہ تو قتل عمد کی دیت کی متحمل ہوتی ہے نہ غلام کے جرم کی۔ نہ مال صلح کی، نہ اس مال کی جو اقرار مجرم سے واجب ہوا اور نہ موضحہ زخم کے کم کا جرمانہ اور موضحہ کا جرمانہ جان کی دیت کے دسویں حصے کا نصف ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ برادری کا یہ بوجھ اٹھانا مجرم کو تباہی سے بچانے کے لیے ہوتا ہے اور قلیل مقدار کے برداشت کرنے میں کسی قسم کی تباہی اور مشقت نہیں ہوتی۔ یہ چیز تو کثیر مقدار کی صورت میں پیش آتی ہے اور قلیل و کثیر کا فرق دلیل سمعی سے معلوم ہو گیا۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا جو مقدار نصف عشر الدیت سے کم ہو وہ مجرم کے مال سے ادا کی جائے گی۔ قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ قلیل و کثیر کا حکم یکساں ہوتا اور ہر ایک مقدار عاقلہ پر واجب ہوتی جیسا کہ امام شافعیؒ کا نظریہ ہے یا اس امر میں برابری ہوتی کہ عاقلہ پر کچھ بھی واجب نہ ہوتا مگر ہم نے قیاس کو روایت کردہ حدیث

کی بناء پر چھوڑ دیا اور اس حدیث کی بناء پر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
سے مروی ہے کہ آپ نے جنین کی دیت عاقلہ پر واجب فرمائی۔
جو مرد کی جان کی دیت کے دسویں حصے کا نصف ہے جیسا کہ کتاب
الدیات میں بیان کیا گیا ہے۔ اور جو مقدار دسویں حصے کے نصف سے
کم ہے اس میں دیگر اموال جیسا طریقہ اختیار کیا جائے گا کیونکہ وہ باہمی
مقرر کردہ حکم کے فیصلہ سے واجب ہوتا ہے جیسے مال کا ضمان
قیمت کے حساب سے واجب ہوتا ہے لہٰذا قیاس پر عمل کرتے
ہوئے یہ مقدار مجرم کے مال سے واجب ہوگی۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا۔ عاقلہ جنایت غلام کی دیت
ادا نہیں کرے گی اور نہ اس مال کی جو بذریعہ صلح لازم ہوا اور نہ اس مال
کی جو مجرم کے اعتراف سے لازم ہو۔ مذکورہ بالا حدیث کی بناء پر۔
دوسری بات یہ ہے کہ غلام سے باہمی نصرت نہیں ہوتی اور اقرار و صلح
سے برادری پر کچھ لازم نہیں آتا کیونکہ عاقلہ پر اس سے ولایت حاصل
نہیں ہوتی۔ ہاں اگر عاقلہ اس کے اقرار کی تصدیق کر دے تو اس پر
مال لازم ہوگا کیونکہ یہ مال ان کی باہمی تصدیق سے لازم آیا۔ اور اس
کے وجوب کا امتناع صرف ان کے حق کی وجہ سے تھا اور ان کو اپنی
ذات پر ولایت حاصل ہے (لہٰذا وہ اقرار کی تصدیق کر کے مال اپنے
اوپر لازم کر سکتے ہیں)

مسئلہ:۔ ایک شخص نے قتل خطاء کا اقرار کیا۔ اولیاء مقتول نے

قاضی کی عدالت میں مقدمہ دائر نہ کیا حتیٰ کہ چند سال بیت گئے تو
دیت کا فیصلہ اسی کے مال سے کیا جائے گا جو تین سال میں واجب الاداء
ہوگا۔ مدت کی ابتداء فیصلے کے دن سے ہوگی۔ کیونکہ تین سال کی یہ
مہلت فیصلے کے وقت سے اس قتل میں دی جاتی ہے جو حجت و شہادت
سے ثابت ہو اور جو قتل خود قاتل کے اقرار سے ثابت ہو اس میں
بدرجہ اولیٰ مدت کا آغاز فیصلے کے وقت سے ہوگا۔

مسئلہ:۔ اگر قاتل اور اولیاءِ مقتول باہم اس بات کی تصدیق کریں
کہ فلاں شہر کے قاضی نے شہادت کے ذریعے دیت کا فیصلہ قاتل کی
برادری پر کیا ہے جو کوفہ میں ہے لیکن قاتل کی برادری نے قاتل اور
اولیاءِ مقتول کی تکذیب کر دی تو برادری پر کچھ واجب نہ ہوگا۔ کیونکہ
ان کی باہمی تصدیق برادری کے لیے حجت نہیں۔ اور خود قاتل پر اس
کے مال سے بھی کچھ واجب نہ ہوگا کیونکہ دونوں کی باہمی تصدیق سے
دیت بحکم قاضی اس کی برادری پر واجب ہوئی تھی۔ ان کی باہمی تصدیق
ان کے حق میں حجت ہے بخلاف مسئلہ اول کے (یعنی اقرار صلح کا مسئلہ۔
اس میں اقرار کرنے والے پر مال لازم ہو جاتا ہے)۔

اگر قاتل کے لیے عاقلہ کے ساتھ کوئی وظیفہ ہو تو اس صورت
میں قاتل پر اس کے حصے کے مطابق لازم ہوگا کیونکہ وہ اپنے حصے کے
حق میں اپنے نفس پر اقرار کرنے والا ہے اور برادری کے حق میں ان
کی ذات پر اقرار کرنے والا ہے۔ لہٰذا اس کا اقرار ان کے حق میں

قبول نہ ہوگا)

مسئلہ: امام قدوریؒ نے فرمایا جب ایک آزاد شخص ایک غلام پر جنایت کرے اور اسے خطأً قتل کر دے تو قاتل کی عاقلہ پر غلام کی قیمت واجب ہوگی۔ کیونکہ ہمارے اصول کے مطابق جیساکہ معلوم ہو چکا ہے قیمت ہی غلام کی جان کا معاوضہ ہے۔ امام شافعیؒ کے دو قولوں میں سے ایک قول کے مطابق قیمت قاتل کے مال سے واجب ہوگی کیونکہ امام شافعیؒ کے نزدیک یہ مال کا معاوضہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام شافعیؒ اس کی قیمت واجب کرتے ہیں خواہ وہ قیمت کسی حد تک پہنچ جائے (خواہ آزاد کی دیت کی مقدار سے بھی بڑھ جائے۔ ہمارے اصول کے مطابق غلام کی قیمت آزاد کی دیت سے دس درہم کم ہونی چاہیے۔ کتاب الدیات میں اس پر تفصیلاً بحث ہو چکی ہے)۔

غلام پر نفس سے کم جنایت کی صورت میں تاوان کی متحمل مددگار برادری نہ ہوگی۔ کیونکہ اس قسم کے تاوان کے ساتھ ہمارے نزدیک اموال کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ امام شافعیؒ کے ایک قول کے مطابق برادری اس تاوان کی متحمل ہوگی جیساکہ آزاد شخص کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس پر پہلے بحث گزر چکی ہے۔

ہمارے اصحاب نے فرمایا کہ اگر قاتل کی کوئی برادری نہ ہو تو اس پر واجب دیت بیت المال سے ادا کی جاتی ہے۔ کیونکہ جماعت مسلمین ہی اس کی برادری ہے۔ اور اس نصرت میں بعض کو بعض پر کوئی خصوصیت

نہیں (یعنی تمام مسلمان اس سلسلے میں برابر ہیں) یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص مر جائے تو اس کی میراث بیت المال میں داخل کی جاتی ہے۔ اسی طرح جو جرمانہ اس پر لازم ہوگا بیت المال ہی اس کی ادائیگی کرے گا۔

امام ابو حنیفہؒ سے ایک شاذ روایت میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ دیت اس کے اپنے مال میں ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل قانون کے مطابق قاتل پر دیت کا وجوب ہو کیونکہ دیت تلف کردہ چیز کا معاوضہ ہے اور اتلاف کا عمل قاتل کی طرف سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ برادری تو قاتل کی سہولت اور رعایت کے مدنظر دیت کی متحمل ہوتی ہے جیسے بیان کیا جا چکا ہے جب قاتل کی برادری ہی نہ ہوگی تو حکم اپنے اصل کی طرف لوٹ آئے گا۔

مسئلہ:۔ ملاعنہ عورت کے بچے کی دیت اس کی ماں کی مددگار برادری پر ہوگی کیونکہ اس کا نسب ماں سے ہی ثابت ہے باپ سے نہیں۔ اگر ماں کی برادری نے اس کی دیت ادا کر دی پھر باپ نے اس کی نسب کا دعویٰ کیا تو ماں کی عاقلہ ادا کردہ دیت کے سلسلے میں باپ کے عاقلہ سے رجوع کریں گے لیکن جس وقت قاضی ماں کی عاقلہ کے لیے اس کے باپ کی برادری کو دیت کا حکم دے اس وقت سے سہ سالہ مدت کی ابتداء ہوگی۔ کیونکہ باپ کے دعواءِ نسب سے یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ دیت باپ کی برادری پر واجب تھی اس لیے جب لعان کرنے والے باپ نے اپنی تکذیب خود کر دی تو یہ ثابت ہو گیا کہ نسب باپ سے ثابت ہے

اور جب یہ بات اصل کے لحاظ سے واضح ہو گئی تو ثابت ہوا کہ ماں کی برادری نے اس مال کا تحمل کیا ہے جو باپ کی برادری پر لازم تھا لہٰذا وہ باپ کی برادری سے رجوع کریں گے۔ کیونکہ ماں کی برادری دیت کے ادا کرنے میں مجبور تھی۔

اسی طرح مکاتب اگر اس قدر مال چھوڑ کر مرے کہ جس سے بدلِ کتابت ادا ہو سکتا ہے اور اس کا ایک آزاد بیٹا ہے۔ ابھی اس کا بدلِ کتابت ادا نہیں کیا گیا تھا کہ اس کے بیٹے نے جنایت کا ارتکاب کیا۔ اور اس کی آزاد ماں کی قوم نے دیت ادا کر دی۔ پھر اس کے مکاتب باپ کا معاوضہ کتابت ادا کر دیا گیا (تو ماں کی قوم والے باپ کی قوم سے دیت کی واپسی کے لیے رجوع کریں گے) کیونکہ بدلِ کتابت ادا ہونے پر بچے کی سرپرستی باپ کی قوم کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ اسی وقت سے جبکہ باپ کی آزادی کی ابتداء ہوئی ہے اور وہ اس کی زندگی کے لمحات میں سے آخری لمحہ ہے۔ لہٰذا واضح ہو گیا کہ ماں کی قوم والوں نے باپ کی قوم کی طرف سے دیت ادا کی تھی لہٰذا ان سے رجوع کے مستحق ہوں گے۔

اسی طرح اگر ایک شخص نے ایک بچے کو حکم دیا کہ فلاں شخص کو قتل کر دو۔ بچے نے اسے قتل کر دیا اور بچے کی برادری نے دیت ادا کر دی لیکن جب قاتل کا حکم دینا شہادت سے پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا تو بچے کی برادری ادا کردہ دیت کے سلسلے میں آمر کی برادری سے رجوع کرے گی۔

اگر آمر کے اقرار سے قتل کا حکم ثابت ہو تو آمر کے مال سے ادا کردہ دیت واپس لیں گے۔ تین سال کی مدت میں جس کی ابتداء اس وقت سے ہوگی کہ جس وقت قاضی نے آمر پر یا اس کی برادری پر دیت کی ادائیگی کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ ادائیگی میں سہولت کے مدِنظر دیات کی ادائیگی کے احکام میعادی ہوا کرتے ہیں۔

صاحب ہدایہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں چند مسائل ہیں جن کو امام محمدؒ نے متفرق طور پر ذکر فرمایا ہے اور جس اصل یا قانون پر یہ مسائل نکالے جاتے ہیں یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ اگر قاتل کا حال حکماً بدل جائے اور کسی جدید امر کی وجہ سے اس کی ولاء دوسرے ولاء کی طرف منتقل ہو جائے تو عاقلہ اول سے اس کا جرم منتقل نہ ہوگا۔ خواہ قاضی اس کا حکم دے یا نہ دے۔

پھر اگر کوئی پوشیدہ حالت واضح ہو جائے مثلاً ملاعنہ عورت کے بچے کی نسب کا والد دعویٰ کر دے تو اس کا جرم عاقلہ اول سے منتقل ہو کر دوسری عاقلہ کی طرف پھیر دیا جائے گا۔ قاضی اس بارے میں فیصلہ دے یا نہ دے۔

اگر مجرم کا حال نہیں بدلا۔ لیکن برادری بدل گئی تو اس صورت میں قابلِ اعتبار فیصلے کا وقت ہوگا (برادری بدلنے کی مثال یہ ہے کہ قاتل کا نام پہلے اہل کوفہ کے دیوان میں مندرج تھا اور اہل کوفہ ہی اس کی برادری تھے۔ لیکن دیت کے فیصلے سے پہلے ہی دیوان اہل بصرہ کی طرف

منتقل ہو گیا تو اب برادری اہلِ بصرہ ہو گی)

اگر قاضی نے پہلی برادری پر دیت کا فیصلہ کر دیا ہو تو برادری کے بدلنے سے دیت دوسری برادری کی طرف منتقل نہ ہو گی۔ اور اگر پہلی برادری پر دیت کے وجوب کا فیصلہ نہیں کیا گیا۔ تو برادری بدل جانے کی صورت میں دوسری برادری پر دیت کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اگر برادری ایک ہی ہو لیکن اس کے افراد میں کچھ اضافہ ہو جائے (بچوں کی بلوغت کی وجہ سے) یا اس میں کمی آ جائے (بعض افراد کی موت کی بناء پر) تو یہ سب لوگ دیت کے حکم میں برابر کے شریک ہوں گے۔ خواہ یہ کمی بیشی فیصلہ سے قبل ہو یا فیصلہ کے بعد۔ البتہ دیت کی جو مقدار ادا کی جا چکی ہے وہ اس حکم سے الگ ہے۔

صاحبِ ہدایہؒ فرماتے ہیں کہ جس نے اس قاعدے اور قانون کو غور و فکر کرنے کے بعد مضبوطی سے پکڑ لیا تو اس قانون پر متفرع ہونے والے نظائر یا اضداد کے حکم معلوم کرنے میں سہولت ہو گی۔

وَاللّٰہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

كِتَابُ الْوَصَايَا

وصیّتوں کے احکام

(وصایا وصیت کی جمع ہے۔ وصیت ایسی تملیک ہے جو بطریق تبرّع و احسان موت کے بعد کی حالت کی طرف منسوب ہوتی ہے۔ وصیّت کرنے والے کو موصی کہا جاتا ہے جس کے لیے وصیت کی جائے اور موصیٰ لہٗ کا نام دیا جاتا ہے۔ اور جس چیز کی وصیت کی جائے اسے موصیٰ بہ کہتے ہیں)

بَابُ صِفَةِ الْوَصِيَّةِ مَا يَجُوْزُ مِنْ ذٰلِكَ وَمَا يُسْتَحَبُّ مِنْهُ وَمَا يَكُوْنُ رُجُوْعًا مِّنْهُ

وصیت کا طریق اس کے جائز اور مستحب ہونے کی صورتیں اور جو قول کہ وصیت سے رجوع ہوتا ہے

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا وصیت واجب نہیں بلکہ

مستحب ہے۔ قیاس اس کے جواز کا انکار کرتا ہے کیونکہ وصیت کسی ایسی چیز کی تملیک کا نام ہے جو موصی کے زوال ملکیت کے زمانہ کی طرف منسوب ہوتی ہے (کیونکہ وصیت کا ثمرہ موصی کی موت کے بعد مرتب ہوتا ہے اور اس وقت موصی کی ملکیت زائل ہو چکی ہوتی ہے)۔

اگر اپنی ملکیت کے قیام کی حالت میں کسی چیز کی نسبت آئندہ زمانے کی طرف کرے مثلاً کہے کہ میں تمہیں اس چیز کا مالک آئندہ کل سے بناتا ہوں تو یہ باطل ہے اس لیے اپنی ملکیت کے زوال پر کسی کو مالک بنانا بدرجۂ اولیٰ باطل ہوگا۔ لیکن ہم نے قیاس کو ترک کرتے ہوئے استحساناً وصیت کو جائز قرار دیا کیونکہ لوگوں کو اس کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے اس لیے کہ انسان اپنی خواہشات اور تمناؤں کی وجہ سے دھوکے میں مبتلا ہو جاتا ہے اور مال ومتاع کی کثرت کی بناء پر نیک اعمال میں کوتاہی سے کام لیتا ہے لیکن جب اسے مرض سے سابقہ پیش آتا ہے تو وہ ڈر جاتا ہے کہ شاید موت لاتوں رات ہی اس کا چراغ زندگی گل کردے تو اسے اس چیز کی ضرورت درپیش آتی ہے کہ اعمال کے سلسلے میں اس نے جس قدر کوتاہی اور تقصیر کا ارتکاب کیا ہے مال خرچ کرکے ان تقصیرات کی تلافی کردے حتیٰ کہ اگر وہ مال خرچ کرنے سے تلافیٔ مافات کرسکے تو اس کے لیے اخروی مقاصد کا حصول ممکن ہو جائے (تو وہ وصیت کی طرف اقدام کرتا ہے) اور اگر وہ صحت یاب ہو جائے تو مال اپنی دنیوی ضروریات اور دیگر مقاصد میں صرف کرے۔

(تاکہ اس کی دنیا بھی سنور جائے اور آخرت بھی) وصیت کے شروع ہونے میں شریعت کا یہی مقصد ہے (کہ انسان اگر مر جائے تو اسے ان اموال کا معاوضہ ملے جو اس نے بطورِ وصیت صرف کیے ہیں اور اگر زندہ رہے تو اپنی ضروریات پوری کرے اور آخرت کی اصلاح کے لیے بھی مال کو کام میں لائے) لہٰذا ہم نے بھی وصیت کو مشروع قرار دیا۔ ایسا ہی ایک قانون ہم نے اجارہ کی مشروعیت کے سلسلے میں کتاب الاجارہ میں بیان کیا ہے۔

جہاں تک اس اعتراض کا تعلق ہے کہ جب موصی کی ملکیت زائل ہو جاتی ہے تو موصی لہٗ کی تملیک عمل میں آتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ضرورت و احتیاج کے مدِ نظر موصی کی ملکیت کا وصف موت کے بعد بھی قابلِ اعتبار ہوتا ہے جیسے کہ تجہیز و تکفین اور قرضوں کی مقدار کے مطابق میت کی ملکیت کو قابلِ اعتبار سمجھا جاتا ہے۔

جوازِ وصیت کے بارے میں کتابِ الٰہی بھی ناطق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ یعنی میت کے ترکہ کی تقسیم وصیت نافذ کرنے اور قرض کی ادائیگی کے بعد ہوگی۔

سنتِ رسول سے بھی وصیت کا جواز ملتا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے تہائی مال تمہاری انتہائے عمر کی حالت میں تم پر صدقہ کیے تاکہ تمہارے اعمالِ صالحہ میں اضافہ ہو سکے لہٰذا اس تہائی مال کو جہاں چاہو یا جہاں پسند کرو خرچ کرو۔

جوازِ وصیت پر امت مسلمہ کا اجماع ہے۔ اجنبی شخص کے لیے تہائی مال سے وصیت کرنا وارثوں کی اجازت کے بغیر بھی صحیح ہے اس کی دلیل ہماری پیش کردہ حدیث ہے اور وصیت کا جو طریقہ افضل و مناسب ہے ہم ان شاء اللہ عنقریب بیان کریں گے۔

مسئلہ:- امام قدوریؒ نے فرمایا جو مقدار ترکہ کی تہائی سے زائد ہو اس میں وصیت جائز نہیں۔ حدیث سعدؓ بن ابی وقاص میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تہائی کی وصیت کردو اور تہائی بھی بہت ہے جب کہ آپ نے حضرت ابن ابی وقاص کے کل مال اور نصف مال کی وصیت کو رد کر دیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ ترکہ وارثوں کا حق ہوتا ہے کیونکہ میت کی موت سے ایک ایسے سبب کا انعقاد ہو جاتا ہے کہ مرنے والے کی ملکیت زائل ہو کر اس کے وارثوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور وہ سبب میت کا مال سے مستغنی ہو جانا ہے پس اس سبب کی وجہ سے واجب ہو گیا کہ اس مال کے ساتھ ورثاء کا حق متعلق ہو جائے لیکن اجنبی کے لیے وصیت کی صورت میں شریعت نے ورثاء کی ملکیت کو ترکہ کی تہائی تک مؤثر قرار نہیں دیا تاکہ اس کی تقصیرات اور کوتاہیوں کی تلافی ہو سکے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے اور شریعت نے ورثاء کے حق کو تہائی مال میں مؤثر رکھا جب کہ وارثوں میں سے کسی کے لیے وصیت کی جائے (ورثاء کے لیے وصیت جائز نہیں ہوتی)

کیونکہ ظاہر یہی ہے کہ میت اس تہائی کو وارثوں پر صدقہ نہیں کرے گا تاکہ بعض ورثاء کو دیگر بعض ورثاء پر فوقیت اور ترجیح دینے سے احتراز ہو سکے۔ جیسا کہ آئندہ سطور میں بیان کیا جائے گا۔ حدیث میں وارد ہے کہ وصیت کے معاملہ میں ظلم و زیادتی سے کام لینا کبیرہ گناہوں میں بہت بڑا گناہ ہے۔ محدثین نے اس ظلم کی تفسیر یہ کی ہے کہ تہائی ترکہ سے زیادہ کی وصیت کی جائے یا وارث کے لیے وصیت کی جائے۔

امام قدوری نے فرمایا البتہ اگر تہائی مال سے زائد مقدار کی اجازت موصی کی موت کے بعد اس کے وارث دے دیں تو جائز ہے بشرطیکہ یہ لوگ بالغ ہوں۔ کیونکہ تہائی سے زائد میں ممانعت انہی کے حق کی وجہ سے تھی اور انھوں نے اپنا حق خود ساقط کر دیا۔

اگر ورثاء نے موصی کی زندگی میں اجازت دی تو اس کا اعتبار نہ ہوگا کیونکہ یہ اجازت ان کے حق کے ثابت ہونے سے پہلے ہے۔ اس لیے کہ ورثاء کا حق موت کے وقت ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ موصی کی موت کے بعد انھیں استردادِ اجازت کا اختیار حاصل ہوگا بخلاف اس اجازت کے جو بعد از موت دی جائے اس کے استرداد کا اختیار انھیں نہیں ہوتا کیونکہ یہ اجازت ان کا حق ثابت ہونے کے بعد ہوتی ہے لہٰذا وہ اجازت سے رجوع نہیں کر سکتے کیونکہ جو چیز ساقط ہو جائے وہ معدوم ہو جاتی ہے۔

(اگر سوال کیا جائے کہ جو اجازت موت سے پہلے ہے وہ بھی اس مال سے متعلق ہے جو آخر کار وارثوں کے پاس آتا ہے تو ایسی اجازت بھی معتبر ہونی چاہیے۔ جواب میں کہا گیا کہ اگرچہ ابتداءِ مرض ہی سے ورثاء کی ملکیت متعلق ہو جاتی ہے لیکن ان کا اجازت دینا صحیح نہیں کیونکہ موصی کی زندگی میں انھیں تصرف کا اختیار نہیں ہوتا) زیادہ سے زیادہ یہ ممکن ہے کہ اس کا استناد بوقت اجازت ہوگا لیکن استناد اور اضافت کا اثر اس چیز میں ظاہر ہوتا ہے جو قائم و موجود ہو اور موت سے پہلے کی اجازت گزر چکی ہے اور معدوم ہو چکی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حقیقی ملکیت تو موصی کی موت کے وقت ثابت ہوتی ہے اور موت سے پہلے محض حق ثابت تھا۔ اس لیے کہ اگر ثبوتِ حق کی نسبت موت سے پہلے کی اجازت کی طرف کی جائے تو حق حقیقت کی صورت میں تبدیل ہو جائے گا (حالانکہ حق اور حقیقت میں فرق ہوتا ہے) اگر کوئی شخص اپنا حق باطل کرنے پر راضی ہو تو یہ رضامندی حقیقی ملکیت کے مٹانے پر نہ ہوگی (یعنی مورث کی زندگی اور مرض الموت میں ورثاء کو مال میں صرف حق حاصل تھا اور انھوں نے موصیٰ لہ کے لیے مقدار وصیت میں اجازت دے کر اپنا حق مٹا دیا لیکن ابھی حقیقی ملک انھیں حاصل نہیں تو یہاں تک حق کا تعلق تھا اس حد تک رضامندی موجود تھی اور موصی کی موت کے بعد جب انھیں حقیقی ملکیت حاصل ہو گئی تو پہلی رضامندی کافی نہ

ہو گی کیونکہ شاید حق مٹانے تک راضی ہوں اور حقیقی ملک مٹنے پر راضی نہ ہوں۔ عین الہدایہ)

اسی طرح مورث نے اگر اپنے وارث کے لیے وصیت کی اور باقی وارثوں نے اجازت دے دی تو اس کا وہی مذکورہ حکم ہے کہ موت سے پہلے کی اجازت قابل اعتبار نہیں اور موت سے بعد کی اجازت معتبر ہے)۔

ہر وہ وصیت جو وارث کی اجازت سے جائز ہو جائے ہمارے نزدیک موصٰی لہٗ کو اس کی ملکیت موصی کی جانب سے حاصل ہوتی ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک وارث کی طرف سے حاصل ہوتی ہے۔ صحیح قول ہمارا قول ہے۔ کیونکہ وصیت جو ملکیت کا سبب ہے وہ موصی کی طرف سے صادر ہوئی ہے اور وارث کی اجازت دینا تو صرف مانع اور روک کو دور کرنا ہے (اور دفع مانع کو تملیک کا درجہ نہیں دیا جا سکتا) وصیت کی صحت کے لیے موصٰی لہٗ کا قبضہ شرط نہیں۔ اور یہ صورت ایسے ہو جائے گی کہ جیسے راہن مال مرہون کو بیع کرے اور مرتہن اس کی اجازت دے دے (تو راہن سے سبب ملک صادر ہوا ہے اور مرتہن مانع کو دور کرنے والا ہے۔ سراج)

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا۔ جب کہ قاتل خود قتل کا ارتکاب کرے خواہ عمداً قتل ظہور پذیر ہو یا خطاً اس کے لیے وصیت جائز نہ ہو گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قاتل کے لیے وصیت نہیں ہوا کرتی۔ کیونکہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ایک معیّنہ

وقت کے بعد مقدر کر رکھی تھی اس نے اس چیز کے حصول میں عجلت سے کام لیا۔ لہٰذا وہ وصیت سے محروم رہے گا جیسا کہ وہ وراثت سے محروم رہتا ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ قاتل کے لیے وصیت جائز ہے۔ اور اسی اختلاف پر یہ صورت بھی محمول ہے کہ جب ایک شخص نے ایک آدمی کے لیے وصیت کی پھر موصیٰ لہ نے موصی کو قتل کر دیا تو ہمارے نزدیک قتل کر دینے سے وصیت باطل ہو جائے گی اور امام شافعیؒ کے نزدیک باطل نہ ہوگی۔ ان دونوں صورتوں میں ہماری پیش کردہ حدیث (لَا وَصِیَّةَ لِلْقَاتِلِ) امام شافعیؒ کے خلاف حجت ہے۔

مسئلہ:۔ اگر ورثاء قاتل کے لیے وصیت کی اجازت دے دیں تو امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک یہ وصیت جائز ہوگی۔ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جائز نہ ہوگی کیونکہ اس کی جنایت باقی ہے اور محروم ہونا اسی جنایت کی بناء پر تھا۔

طرفینؒ کی دلیل یہ ہے کہ وصیت کا ممنوع ہونا ورثاء کے حق کی وجہ سے تھا (لیکن ان کی اجازت سے جائز ہوگی) کیونکہ وصیت کے باطل ہونے کا نفع انہی کو پہنچنا تھا جیسے میراث باطل ہونے کا نفع انہی کو پہنچتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ورثاء قاتل کے حق میں وصیت پر راضی نہیں ہوتے جیسے کہ تمام ورثاء ایک وارث کے لیے راضی نہیں ہوتے۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا۔ اپنے کسی وارث کے لیے وصیت جائز نہیں ہوتی کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو اس کا حق دے دیا ہے لہذا آگاہ ہو کہ کسی وارث کے لیے وصیت جائز نہ ہوگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ بعض ورثاء کو بعض پر ترجیح دینے میں محروم الوصیت وارث کے لیے دکھ کا باعث ہوگا۔ اس لیے اسے جائز قرار دینے میں قطع رحمی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا روایت کردہ حدیث کی روشنی میں اس طرح کی وصیت ظلم وتعدی کے مترادف ہے۔

موصیٰ لہٗ کا وارث ہونا یا غیر وارث ہونا موت کے وقت معتبر ہوگا وصیت کے وقت معتبر نہیں۔ کیونکہ وصیت ایسی تملیک ہوتی ہے جو موت کے بعد کی طرف منسوب ہوتی ہے اور اس کا حکم بھی موت کے بعد ثابت ہوتا ہے۔ مرض الموت میں مریض کا کسی وارث کو ہبہ کرنا بھی وصیت کی نظیر ہے کیونکہ ہبہ بھی حکماً وصیت ہوتا ہے حتیٰ کہ ترکہ کی تہائی سے نافذ کیا جاتا ہے اور مریض کا وارث کے لیے اقرار کرنا اس کے برعکس ہے (یعنی فی الحال وارث ہونا معتبر ہوگا) کیونکہ اقرار ایسا تصرف ہے جو فی الحال واقع ہوتا ہے اس لیے اقرار کے وقت ہی اس کا اعتبار ہوگا۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا اگر دوسرے وارث اس کی اجازت دے دیں تو وصیت جائز ہوگی۔ یہ استثناء اس حدیث میں بھی

مذکور ہے جو ہم نے روایت کی۔ کیونکہ وصیت کا ممنوع ہونا ان کے حق کی بنا پر ہوتا ہے لیکن ان کے اجازت دینے سے جائز ہو گی۔ اگر بعض ورثاء نے اجازت دے دی اور بعض نے رد کر دیا تو اجازت دینے والوں کے حصہ کے مطابق معتبر ہو گی کیونکہ ان کو اپنے حصہ پر اختیار حاصل ہوتا ہے اور رد کرنے والوں کے حق میں باطل ہو جائے گی۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا۔ مسلمان کا کافر کے لیے اور کافر کا مسلمان کے لیے وصیت کرنا جائز ہے۔ پہلی صورت یعنی مسلم کی وصیت برائے کافر کا جواز اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ عَنْ دِيَارِكُمْ الآیۃ یعنی جن لوگوں نے تم سے قتال نہیں کیا اور تم کو گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ تعالیٰ تم کو ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے اور احسان کرنے سے منع نہیں فرماتا۔

دوسری صورت یعنی وصیتِ کافر برائے مسلم کی دلیل یہ ہے کہ کفار عقدِ ذمہ کی وجہ سے معاملات میں مسلمانوں کے برابر ہیں لہٰذا جانبین کی طرف سے زندگی میں تبرع و احسان جائز ہے اسی طرح موت کے بعد بھی جائز ہو گا۔ الجامع الصغیر میں مذکور ہے اہلِ حرب کے لیے وصیت کرنا باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قَاتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ۔ یعنی جن کافروں نے دین میں تم سے قتال کیا اللہ تعالیٰ تم کو ان سے منع فرماتا ہے کہ ان کے

ساتھ اس قسم کا احسان کیا جائے۔

مسئلہ:- امام قدوریؒ نے فرمایا وصیت کا وہ قبول کرنا معتبر ہوگا جو موت کے بعد ہو۔ اگر موصیٰ لہٗ نے موصی کی زندگی میں قبول کیا یا رد کر دیا تو یہ قبول یا انکار ناقابلِ اعتبار ہوگا۔ کیونکہ وصیت کے ثابت ہونے کا وقت موصی کی موت کے بعد ہوتا ہے اس لیے کہ وصیت کا تعلق موت سے ہوتا ہے اور موت سے پہلے اس کا اعتبار نہ ہوگا جیساکہ عقدِ وصیت سے پہلے موصیٰ لہٗ کے قبول اور انکار کا اعتبار نہیں ہوتا۔

مسئلہ:- امام قدوریؒ نے فرمایا مستحب یہ ہے کہ موصی تہائی مال سے کم کی وصیت کرے خواہ ورثاء اغنیاء ہوں یا فقراء کیونکہ تہائی مال سے کم کی وصیت کرنے میں اپنا مال ان کے لیے چھوڑنے میں ان کے ساتھ صلہ رحمی کرنا ہے۔ بخلاف اس کے جب تہائی حصے کی پوری وصیت کرے تو نہ اس میں رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی ہے اور نہ ان پر کسی قسم کا احسان ہے کیونکہ موصی نے اپنا پورا حق وصول کر لیا۔

پھر مشائخ نے اس بات پر بھی بحث کی ہے کہ تہائی سے کم حصّہ میں وصیت کرنا بہتر ہے یا وصیت کا ترک کرنا۔ انھوں نے فرمایا کہ اگر ورثاء مفلوک الحال ہیں اور وراثت میں جو حصّہ ان کو ملے اس سے انھیں استغنا حاصل نہ ہو تو ترکِ وصیت بہتر ہے کیونکہ ایسی صورت میں اقرباء پر صدقہ کا اجر حاصل ہوگا۔ نیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا

ارشاد ہے کہ سب سے افضل صدقہ وہ ہے جو بُغض رکھنے والے رشتہ دار کو دیا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ترکِ وصیت میں حق فقراء اور حق قرابت دونوں کی رعایت ملحوظ ہوتی ہے۔ اگر ورثاء خوشحال ہوں یا وراثت سے حصہ لینے پر انھیں استغناء حاصل ہوجائے تو اس صورت میں وصیت کرنا بہتر ہے۔ کیونکہ اس کی حیثیت اجنبی پر صدقے کی ہوگی۔ اور ترکِ وصیت رشتہ داروں کے لیے ہبہ ہوگا۔ اور پہلی چیز یعنی اجنبی پر صدقہ کرنا افضل ہے۔ کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا مطلوب ہوتی ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ اس صورت میں موصی کو اختیار ہوگا کیونکہ دونوں میں ایک نہ ایک طرح کی فضیلت موجود ہے یعنی صدقہ کی فضیلت یا صلہ رحمی کی فضیلت۔ لہٰذا دو نیک کاموں میں اسے اختیار رہوگا۔

مسئلہ۔ امام قدوریؒ نے فرمایا۔ موصیٰ بہ یعنی وصیت کردہ چیز پر موصیٰ لہٗ کے قبول کرنے سے ملکیت حاصل ہوجاتی ہے۔ امام زفرؒ کو اس سے اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ کے دو قولوں میں سے ایک قول بھی یہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ وصیت میراث کی بہن ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک میت کی طرف سے نیابت ہے اس لیے کہ ان سے مورث کی ملکیت وارث کی طرف منتقل ہوجاتی ہے پھر جس طرح

وارث کے قبول کرنے کے بغیر بھی وراثت ثابت ہو جاتی ہے اسی طرح وصیت بھی موصیٰ لہٗ کے قبول کیے بغیر ثابت ہو جائے گی۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ وصیت ملک جدید کے ثابت کرنے کا نام ہے (خلافت و نیابت کے طریقے سے نہیں) اسی بناء پر موصیٰ لہٗ اُسے بوجہ عیب واپس نہیں کر سکتا۔ اور نہ موصیٰ لہٗ پر عیب کی وجہ سے واپس کی جا سکتی ہے۔ اور کسی شخص کو یہ اختیار نہیں کہ وہ کسی دوسرے کے لیے اس کے قبول کرنے کے بغیر ملکیت اس کے لیے ثابت کر دے۔
جہاں تک وراثت کا تعلق ہے وہ مورث کی طرف سے نیابت و خلافت ہوتی ہے حتیٰ کہ اس میں واپس کرنے یا واپس لینے کے احکام جاری ہوتے ہیں (مثلاً میّت نے کوئی چیز خریدی اور مر گیا اب وارث نے اس میں عیب پایا تو وہ بائع کو واپس کر سکتا ہے لیکن موصیٰ لہٗ ایسا نہ کر سکتا تھا یا میّت نے کوئی چیز اپنی زندگی میں فروخت کی اور مر گیا۔ مشتری نے مبیع میں کوئی عیب پایا تو وہ وارث کو واپس کر سکتا ہے لیکن موصیٰ لہٗ کی صورت میں واپسی ممکن نہ تھی۔ کیونکہ وارث تو مورث کا نائب ہوتا ہے اور موصیٰ لہٗ نائب نہیں ہوتا بلکہ جدید مالک ہوتا ہے) لیس وراثت کی ملکیت شرع کی جانب سے قبول کیے بغیر جبراً بھی ثابت ہو جاتی ہے لیکن وصیت میں یہ بات نہیں ہوتی بلکہ موصیٰ لہٗ کی قبولیت شرط ہوتی ہے۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا (حاصل یہ ہوا کہ موصیٰ لہٗ کی قبولیت

کے بغیر ملکیت ثابت نہیں ہوتی) سوائے ایک صورت کے اور وہ یہ ہے
کہ موصی وفات پا جائے اور موصیٰ لہٗ بھی قبول کرنے سے پہلے فوت ہو
جائے تو موصیٰ بہٖ یعنی وصیت کردہ چیز موصیٰ لہٗ کے ورثاء کی ملکیت میں
داخل ہو جائے گی استحسان کے مدنظر۔ قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ وصیت
باطل ہو جائے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ ملکیت قبول کرنے پر موقوف
ہوتی ہے تو یہ صورت ایسے ہی ہو گی کہ بائع کے ایجاب کے بعد مشتری
قبول کرنے سے پہلے مر جائے (تو بیع نافذ نہیں ہوتی لیکن ہم نے قیاس
کو ترک کرتے ہوئے استحسان کو مدنظر رکھا)

استحسان کی وجہ یہ ہے کہ موصی کی موت کی وجہ سے وصیت ہر
لحاظ سے مکمل ہو چکی ہے اب اس پر فسخ طاری نہیں ہو سکتا اور اس
میں جو توقف تھا وہ موصیٰ لہٗ کے حق کی وجہ سے تھا لیکن موصیٰ لہٗ کے حق
کی وجہ سے تھا لیکن موصیٰ لہٗ کی موت پر وہ مال اس کی ملکیت میں داخل
ہو جائے گا جیسا کہ وہ بیع جو مشروط بالخیار ہو اور خیار مشتری کو حاصل
ہو اور مشتری اجازت دینے سے پہلے مر جائے (تو مبیع مشتری کی
ملکیت میں آ جائے گا اور ورثاء کے لیے ہو گا)

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا۔ اگر کوئی شخص وصیت کرے
در آنحالیکہ اس پر اس قدر قرض ہو جو اس کے تمام مال کو محیط ہو تو وصیت
جائز نہ ہو گی کیونکہ قرض کو وصیت پر فوقیت حاصل ہوتی ہے اس
لیے کہ قرض دونوں ضروریات میں سے زائد اہم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے

کہ قرض کی ادائیگی کو فرض کا درجہ حاصل ہے اور وصیت کو تبرع واحسان کا۔ اور ہمیشہ ابتداء اہم تر سے کی جاتی ہے پھر اہم کی طرف توجہ دی جاتی ہے۔ البتہ اگر قرض خواہ اس کو قرض سے بری کردیں (تو وصیت جائز ہوگی) کیونکہ اب دین باقی نہ رہا اس لیے شریعت کی مقرر کردہ حدود پر وصیت نافذ ہوگی۔ کیونکہ موصی اس امر کا محتاج ہے کہ وصیت کے نفوذ سے اس کی تقصیرات کی تلافی ہو۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا بچے کی وصیت صحیح نہیں ہوتی۔ امام شافعیؒ جواز کے قائل ہیں بشرطیکہ وصیت خیر کے کاموں میں کی گئی ہو۔ کیونکہ سیّدنا فاروق اعظمؓ نے یفاع یا یافع لڑکے کی وصیت کو نافذ قرار دیا تھا اور وہ قریب البلوغ تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں بچے کی بہتری ہے کہ وہ اپنی ذات کے نفع کے لیے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے اس کی راہ میں خرچ کرے۔ اور اگر وصیت کو نافذ قرار نہ دیا جائے تو یہ مال دوسروں کے لیے باقی رہے گا۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ وصیت کو تبرّع واحسان کی حیثیت حاصل ہے اور بچے میں تبرّع کی اہلیت نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ بچے میں یہ اہلیت نہیں ہوتی کہ اس کا قول کسی چیز کو لازم کرنے والا ہو۔ اگر اس کی وصیت کو نافذ قرار دیں تو لازم آئے گا کہ بچے کے قول کو لازم کرنے والا کہا جائے (اور یہ اصول کے خلاف ہے) اور جو روایت

آپ نے پیش کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بچے کے بالغ ہونے کا زمانہ بہت قریب تھا جس کو مجازاً قریب البلوغ کہہ دیا گیا۔ یا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بچے نے اپنی تجہیز و تکفین کے بارے میں وصیت کی تھی اور ایسی وصیت ہمارے نزدیک بھی جائز ہے۔ اگر بچے کی وصیت کو نافذ قرار نہ دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے اپنا مال ورثاء کے لیے چھوڑ دیا یہ مال ورثاء پر صدقہ ہوگا اور وہ آخرت میں اجر جزیل پائے گا جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

نفع اور نقصان میں قابل اعتبار امر یہ ہے کہ شریعت کے متعین کردہ تصرفات کو ملحوظ رکھا جائے۔ نہ کہ فی الحال جیسا بھی تصرف درپیش ہو اس کو اپنا لیا جائے چنانچہ طلاق کو لیجیے کہ بچے کو یا اس کے وصی کو طلاق کا اختیار نہیں ہوتا اگرچہ بعض حالات میں طلاق دینا ہی سودمند ہوتا ہے۔

اسی طرح بچے کی وصیت جائز نہیں جب کہ اس نے بچپن کی حالت میں وصیت کی اور بلوغ کے بعد مر گیا کیونکہ عقد وصیت کے وقت وہ اہلیت سے محروم تھا۔

اسی طرح بچے کی یہ وصیت بھی درست نہ ہوگی اگر وہ کہے کہ جب میں بالغ ہو جاؤں تو میرا تہائی مال فلاں شخص کے لیے بطور وصیت ہوگا۔ کیونکہ اس کی اہلیت ہی قصور ہے۔ اور نابالغ بچہ نہ تو فی الحال وصیت کرنے کا اہل ہوتا ہے اور نہ کسی زمانہ و حالت سے معلق کرنے کی اس

میں اہلیت ہوتی ہے۔ جیسا کہ طلاق وعتاق میں ہوتا ہے (کہ نابالغ بچہ تنجیزاً وتعلیقاً ان کا مالک نہیں ہوتا) بخلاف اس کے اگر غلام یا مکاتب کہے کہ جب میں آزاد ہو جاؤں تو میرا تہائی مال فلاں کے لیے وصیت ہے پھر آزاد ہو کر مرا تو وصیت صحیح ہو گی کیونکہ ان دونوں میں عقل و بلوغ کی بناء پر پوری اہلیت موجود ہے۔ مانع صرف آقا کا حق ہے تو اس تصرف کی نسبت مانع کے ساقط ہونے کے وقت کی طرف صحیح ہو گی۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا۔ مکاتب کی وصیت صحیح نہیں ہوتی اگرچہ وہ بدلِ کتابت کے مطابق مال چھوڑ کر مرے۔ کیونکہ اس کا مال قابلِ تبرع نہیں ہوتا۔ بعض حضرات نے کہا کہ امام ابوحنیفہؒ کے قول پر مکاتب کی وصیت صحیح نہیں اور صاحبینؒ کے نزدیک صحیح ہے۔ جیسے مکاتب کا عتق اس طرح صحیح ہے۔ مثلاً مکاتب یوں کہے کہ ہر وہ غلام جس کا آئندہ میں مالک بنوں وہ آزاد ہے۔ پھر مکاتب نے آزادی حاصل کر لی اور غلام کا مالک بنا تو وہ غلام آزاد ہو جائے گا۔ صاحبینؒ نے وصیت کو بھی اسی پر محمول کیا ہے۔ حالانکہ اس مسئلہ میں امامؒ اور صاحبینؒ کے درمیان اختلاف معروف ہے جو اپنے موقع پر مذکور ہے۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا۔ اور جائز ہے وصیت حمل کے لیے یا حمل کی جب کہ وصیت کے وقت سے چھ ماہ سے کم مدت میں وضعِ حمل ہو جائے (حمل کی کسی شخص کے لیے وصیت کی یہ مثال ہے کہ جو کچھ میری باندی کے پیٹ میں ہے وہ فلاں کے لیے وصیت ہے)

مسئلہ اول یعنی حمل کے لیے وصیت کے جواز کی دلیل یہ ہے کہ وصیت
ایک جہت سے استخلاف یعنی کسی کو اپنا خلیفہ بنانا ہے کیونکہ موصی
اپنے بعض مال میں موصی لہٗ کو اپنا خلیفہ بناتا ہے۔ اور جنین یعنی جو بچہ
پیٹ میں ہے میراث میں خلیفہ ہو سکتا ہے تو وصیت میں بھی خلیفہ ہو
سکے گا کیونکہ وصیت میراث کی بہن ہے۔ البتہ دونوں میں اتنا فرق
ضرور ہے کہ میراث لازمی ہوتی ہے اور وصیت رد کرنے سے رد
ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں مالک بنانے کے معنی پائے جاتے ہیں۔
بخلاف ہبہ کے (یعنی حمل کے لیے ہبہ صحیح نہیں ہوتا کیونکہ ہبہ تملیک
محض ہوتا ہے اور جنین پر کسی کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ اسے کسی چیز
کا مالک بنا سکے)

مسئلہ دوم یعنی کسی شخص کے لیے حمل کی وصیت کرنے کے جواز کی دلیل
یہ ہے کہ حمل ولادت کی بناء پر معرض وجود میں آنے والا ہے۔ اس
لیے کہ بحث اس حمل کے بارے میں ہے جس کا وصیت کے وقت موجود
ہونا یقینی ہے اور جاننا چاہیے کہ وصیت کا باب محدود نہیں بلکہ
وسیع ہے میت کی ضرورت و حاجت اور موت کے بعد اس کی عاجزی
کو مد نظر رکھتے ہوئے اسی بناء پر غیر موجود چیزوں میں بھی وصیت صحیح ہوتی
ہے (مثلاً باغات کے پھلوں کی وصیت کرنا جو ابھی تک درختوں میں
ظاہر نہیں ہوئے) تو موجود چیز کی وصیت بدرجہ اولیٰ صحیح ہو گی۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا اگر کسی شخص نے حمل کو مستثنیٰ کرتے

ہوئے باندی کو وصیت کی تو وصیت و استثناء دونوں صحیح ہوں گے۔ کیونکہ باندی کا لفظ حمل کو شامل نہیں۔ لیکن اگر باندی کا لفظ کسی استثناء کے بغیر بولا جائے تو باندی کے تابع ہوتے ہوئے حمل بھی مستحق ہو جاتا ہے جب اس نے وصیت میں باندی کو تنہا اور مفرد طور پر رکھا تو یہ علیحدہ کرنا صحیح ہوگا۔ اور چونکہ صرف حمل کی وصیت کرنا درست ہے تو اس کا استثناء کرنا بھی جائز ہوگا۔ اور یہی قاعدہ کلیہ ہے کہ جس چیز کو علیحدہ طور پر معقود علیہ بنایا جا سکتا اس کا عقد سے مستثنیٰ کرنا بھی جائز ہوتا ہے۔ کیونکہ افراد عقد اور صحت استثناء میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اور جس چیز کو مفرد طور پر معقود علیہ نہیں بنایا جا سکتا اس کا اس سے استثناء بھی صحیح نہیں ہوتا۔ یہ قاعدہ کلیہ کتاب البیوع میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا موصی کو وصیت کرنے کے بعد اپنی وصیت سے رجوع کرنا بھی جائز ہے۔ کیونکہ وصیت ایک ایسا تبرع ہے جو ابھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا تو اس سے رجوع کرنا جائز ہے جیسا کہ ہبہ سے رجوع جائز ہوتا ہے۔ کتاب الھبہ میں ہم اس پر تحقیقی بحث کر چکے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس کا قبول کرنا موصی کی موت پر موقوف ہوتا ہے اور قبول سے پہلے پہلے ایجاب کو باطل کیا جا سکتا ہے جیسا کہ بیع میں مشتری کے قبول سے پہلے بائع اپنے ایجاب کو باطل

کرسکتا ہے۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا جب موصی نے رجوع کی تصریح کردی اور کوئی ایسا کام کیا جو رجوع پر دلالت کرتا ہے تو یہ رجوع ہوگا۔ صراحۃً رجوع کرنا تو ظاہر ہے۔ اسی طرح دلالۃً رجوع کرنا بھی کافی ہے کیونکہ دلالت بھی صریح کا کام دیتی ہے۔ لہٰذا فعل دلالت اس قولِ صریح کے قائم مقام ہوگا کہ "میں نے اپنی وصیت کو باطل کردیا" اور یہ مسئلہ بیع بشرطِ خیار کی طرح ہوگا۔ اس لیے کہ اگر وہ کوئی ایسا فعل کرے جو خیار کے بطلان پر دلالت کرتا ہو تو خیار باطل ہو جاتا ہے۔

جاننا چاہیے کہ ہر وہ فعل جس کو آدمی غیر کی ملکیت میں کرے جس سے مالک کا حق منقطع ہو جاتا ہے اگر ایسا فعل موصی موصٰی بہ میں کرے تو یہ وصیت سے رجوع کرنا شمار ہوگا۔

ہم نے اس قسم کے افعال کتاب الغصب میں شمار کردیے ہیں۔ ہر ایسا فعل جس سے موصٰی بہ میں اضافہ ہوتا ہو اور اضافے کے بغیر یہ چیز سپرد نہ کی جا سکتی ہو تو ایسا فعل بھی وصیت سے رجوع کرنے کے مترادف ہوگا۔ مثلاً موصی ستوؤں کو گھی کے ساتھ مخلوط کردے یا وصیت کی زمین موصی عمارت تعمیر کرے یا وصیت کی روئی کو لحاف یا توشک میں بھر دے یا وصیت کردہ کپڑے کو استر بنا دے یا وصیت کے ابرے کو ابرا بنا کر کسی لحاف کا استر لگا دے تو یہ تمام صورتیں وصیت سے رجوع ہیں کیونکہ ان صورتوں میں موصی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ اس

اضافے کے سوا موصٰی بہ کو موصٰی لہٗ کے سپرد کردے۔ اور اس اضافے والے تصرف کا توڑنا بھی ممکن نہیں کیونکہ یہ تصرف موصی کی ملکیت میں خود اس کی اپنی طرف سے واقع ہوا ہے۔ بخلاف اس کے اگر کسی مکان کی وصیت کی پھر اس میں سفیدی کرادی یا اس کی عمارت گرادی تو ایسا کرنا رجوع نہ ہوگا کیونکہ یہ تصرف زمین میں نہیں ہے بلکہ زمین کے تابع میں ہے۔

اسی طرح ہر وہ تصرف جس سے موصی کی ملکیت کا زوال لازم آئے وہ بھی وصیت سے رجوع شمار ہوگا۔ مثلاً وہ عین موصٰی بہ کو فروخت کردے تو یہ وصیت سے رجوع ہے خواہ اسے پھر خرید لے۔ یا عین موصٰی بہ کو ہبہ کردے تو یہ وصیت سے رجوع ہے خواہ پھر ہبہ سے رجوع کرلے۔ کیونکہ اپنی ملکیت کے سوا وصیت کا نفاذ نہیں ہو سکتا اور جب موصی نے اپنی ملکیت زائل کردی تو یہ وصیت سے رجوع ہوگا۔

موصٰی بہ بکری کو ذبح کر دینا بھی رجوع ہے۔ کیونکہ عادۃً ایسا کام اپنی ضروریات میں صرف کرنے کے لیے کیا جاتا ہے تو یہ بات بھی ایک قاعدہ کلیہ بن گئی (یعنی اگر موصی ایسا تصرف کرے جو عادۃً اپنی ضروریات میں صرف ہو تو یہ وصیت سے رجوع کے مترادف ہے)

موصٰی بہ کپڑے کا دھو ڈالنا وصیت سے رجوع نہ ہوگا کیونکہ

جو شخص اپنا کپڑا دوسرے کو دینا چاہتا ہے وہ عموماً صاف کر کے اور دھو کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس فعل سے وصیت میں پختگی پیدا ہوگی۔

مسئلہ:۔ امام قدوری نے فرمایا جس شخص نے وصیت سے انکار کر دیا (کہ میں نے اسے وصیت نہیں کی تھی) تو یہ انکار وصیت سے رجوع نہ ہوگا امام محمدؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ یہ وصیت سے رجوع ہوگا۔ کیونکہ رجوع فی الحال نفی کرتا ہے یعنی گویا فی الحال عقدِ وصیت کی نفی کر کے اسے مٹا دیا۔ اور انکار ایسی چیز ہے جس سے فی الحال اور زمانۂ ماضی دونوں میں نفی ہے تو یہ بدرجۂ اولیٰ رجوع ہوگا۔

امام محمدؒ کی دلیل یہ ہے کہ انکار در حقیقت ماضی میں نفی ہے (کہ زمانۂ ماضی میں ایسا نہیں ہوا تھا) اور فی الحال منتفی ہونا اس کے لوازمات سے ہے (کیونکہ جو چیز ماضی میں معدوم تھی تو وہ حال میں کیسے ہوگی) اور جو چیز فی الحال ثابت ہو۔ تو ماضی میں اس کا انکار لغو ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ رجوع کے معنی یہ ہیں کہ یہ چیز زمانۂ ماضی میں ثابت تھی اور فی الحال اس کی نفی ہے اور انکار کا معنی ماضی اور حال دونوں میں نفی کرنا ہے تو انکار در حقیقت رجوع نہ ہوگا۔ اسی بنا پر نکاح سے انکار نکاح سے فرقت نہیں ہوتی۔

اگر موصی نے کہا کہ ہر وہ وصیت جو میں نے فلاں شخص کے لیے

کی ہے وہ حرام اور سود ہے تو موصی کا یہ قول رجوع نہ ہوگا۔ کیونکہ وصف (حرمت اور سود والی) اس امر کی مقتضی ہوتی ہے کہ اصل یعنی موصوف موجود ہو (یعنی جب اصل موصوف موجود ہو تو وصف اس کے ساتھ لاحق ہو سکتا ہے اور وصف کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ موصوف باقی رہے پس وصیت باقی رہے گی)۔

بخلاف اس کے اگر کہا کہ میں نے فلاں کے لیے جو وصیت کی تھی وہ باطل ہے تو یہ رجوع ہوگا کیونکہ معدوم اور نیست و نابود ہونے والی چیز کو باطل کہا جاتا ہے۔

اگر کہے کہ میں نے فلاں شخص کے لیے کی ہوئی وصیت کو مؤخر کر دیا ہے تو یہ رجوع نہ ہوگا۔ کیونکہ تاخیر کسی چیز کے سقوط کے لیے نہیں ہوتی۔ جیسے کہ اگر قرض کی ادائیگی میں تاخیر کی جائے تو قرض ساقط نہیں ہوتا۔ بخلاف اس کے اگر یوں کہے کہ میں نے فلاں شخص کے لیے جو وصیت کی تھی اسے میں نے ترک کر دیا ہے تو یہ رجوع ہوگا۔ کیونکہ ترک کرنا اسقاط یعنی ساقط کرنے کے ہم معنی ہے۔

اگر موصی نے کہا کہ وہ غلام جس کی وصیت میں نے فلاں شخص کے لیے کی تھی وہ اب دوسرے فلاں شخص کے لیے ہے تو یہ رجوع ہوگا۔ کیونکہ یہ الفاظ شرکت کے قطع پر دلالت کرتے ہیں۔ بخلاف اس صورت کے کہ جب وہ ایک شخص کے لیے غلام کی وصیت کرے اور پھر اسی غلام کی دوسرے شخص کے لیے وصیت کر دے تو یہ وصیت

دونوں کے لیے ہوگی۔ کیونکہ محل یعنی غلام قابلِ شرکت ہے اور وصیت کے الفاظ میں بھی یہ صلاحیت ہے۔

اسی طرح اگر موصی نے کہاکہ ہر وہ وصیت جو میں نے فلاں شخص کے لیے کی تھی میں اس غلام کی اپنے فلاں وارث کے لیے وصیت کرتا ہوں تو موصی کا یہ کہنا پہلی وصیت سے رجوع ہوگا۔ جیساکہ ہم بیان کرچکے ہیں اور یہ وصیت وارث کے لیے ہوجائے گی۔ وصیتِ وارث کے احکام کے متعلق ہم پہلے بیان کرچکے ہیں۔ اگر اس مسئلہ میں یہ دوسرا شخص میت ہو۔ جب کہ یہ وصیت کررہا تھا تو پہلی وصیت اپنی حالت پر برقرار رہے گی۔ کیونکہ پہلی وصیت تو اس مجبوری کے تحت باطل ہوتی ہے کہ دوسری وصیت متحقق ہوچکی ہے۔ لیکن اس صورت میں دوسری وصیت کا کوئی وجود ہی نہیں تو پہلی وصیت علیٰ حالہا برقرار رہے گی۔

اگر دوسرا فلاں وصیت کے وقت زندہ تھا لیکن وہ موصی کی وفات سے پہلے مرگیا تو غلام اس صورت میں موصی کے ورثاء کے لیے میراث ہوگا۔ کیونکہ دونوں وصیتیں باطل ہوگئیں۔ پہلی وصیت تو رجوع کی بناء پر باطل ہوگئی۔ اور دوسری موصیٰ لہٗ کی موت کی وجہ سے باطل ہوگئی (اور موصیٰ بہٖ غلام موصی کی ملکیت میں بدستور قائم رہا جو موصی کی موت کے بعد ورثاء کی میراث ہوگا)۔

وَاللّٰہُ جَلَّ شَانُہٗ اَعْلَمُ

بَابُ الْوَصِيَّةِ بِثُلُثِ الْمَالِ

تہائی مال کی وصیت کے بیان میں

مسئلہ:- امام قدوریؒ نے فرمایا ایک شخص نے ایک آدمی کے لیے تہائی مال کی وصیت کی پھر ایک دوسرے شخص کے لیے بھی تہائی مال کی وصیت کی لیکن ورثاء نے تہائی سے زائد مال میں وصیت کی اجازت نہ دی تو تہائی مال ان دونوں میں برابر تقسیم کیا جائے گا کیونکہ تہائی مال میں اتنی گنجائش نہیں کہ دونوں کو پورا پورا حق دیا جاسکے اس لیے کہ ورثاء کی عدم اجازت کی بناء پر وصیت تہائی سے زیادہ نہیں ہو سکتی جیسے کہ کتاب الوصایا کے ابتداء میں بیان کیا گیا ہے۔ اور سبب استحقاق میں دونوں موصی لہما مساوی حیثیت کے حامل ہیں اور محل یعنی تہائی مال شرکت کو قبول کرتا ہے۔ لہٰذا تہائی مال دونوں کے درمیان نصف نصف ہوگا۔

مسئلہ:- اگر موصی ایک شخص کے لیے تہائی کی وصیت کرے

اور دوسرے کے لیے چھٹے حصے کی (اور ورثاء تہائی سے زیادہ مقدار کی اجازت نہ دیں) تو ان دونوں کے لیے تہائی مال تین حصوں میں تقسیم ہوگا (یعنی دو حصے ⅓ والے کے اور ایک حصہ ⅙ والے کا ہوگا) کیونکہ ان میں سے ہر ایک مالِ وصیت کو ایک صحیح سبب کی بناء پر اپنی طرف کھینچنے والا ہے۔ اور تہائی مال ان دونوں کا حق پورا کرنے سے قاصر ہے تو اپنے حق کے مطابق آپس میں تقسیم کرلیں گے جیسا کہ قرضخواہوں کے سلسلے میں ہوتا ہے (کہ ہر قرضخواہ اپنے حصۂ قرض کے مطابق حاصل کرتا ہے) قلیل مقدار والے کو ایک حصہ دیا جائے گا اور اکثر مقدار والے کو دو حصے۔ لہٰذا وصیت تین حصوں میں تقسیم ہوگی۔ چھٹے حصے والا ایک حصہ لے گا اور تہائی والا دو حصے۔

اگر ان دو میں سے ایک کے لیے سارے مال کی وصیت کر دے اور دوسرے کے لیے تہائی مال کی لیکن تہائی سے زائد مقدار کی ورثاء نے اجازت نہ دی تو صاحبینؒ کے نزدیک تہائی مال ان دونوں میں چار حصے بن کر تقسیم ہوگا اور امام صاحب نے فرمایا کہ تہائی مال دونوں میں نصف نصف ہوگا۔ امام ابوحنیفہؒ اس موصیٰ لہٗ کے لیے جس کے حق میں تہائی سے زائد وصیت کی گئی ہے تہائی سے زائد کا حق دار نہیں ٹھہراتے۔ سوائے تین صورتوں کے اول یہ کہ مریض نے بیع محابات کی ہو۔ دوم غلام کی سعایت اور سوم غیر معین دراہم کی وصیت ہو۔ مریض کی بیع محابات کی یہ صورت ہے کہ مریض کے دو غلام ہیں ایک کی

قیمت گیارہ سو ہے اور دوسرے کی چھ سو۔ اس کے علاوہ مریض کا اور کوئی مال نہیں۔ مریض نے وصیت کی کہ ایک غلام سو درہم کے عوض ایک شخص کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے اور دوسرا غلام دوسرے کے ہاتھ ایک سو درہم میں فروخت کیا جائے پہلے شخص کو ایک ہزار کی اور دوسرے کو پانچ سو کی محابات حاصل ہوئی۔ ورثار نے تہائی مال سے زیادہ کی محابات کی اجازت نہ دی تو بقدرِ تہائی ان دونوں کے لیے بمنزلہ وصیت ہوگی کیونکہ یہ محابات مرض الموت میں ہوئی ہے۔ تو اس تہائی میں پہلا شخص بحساب ہزار درہم کے اور دوسرا بحساب پانچ سو درہم کے شریک ہوگا۔ حاشیۃ الہدایہ۔

سعایت کی صورت یہ ہے کہ مریض کے دو غلام ہیں ایک کی قیمت دو ہزار درہم ہے اور دوسرے کی ایک ہزار۔ اس کے علاوہ مریض کا کوئی مال نہیں اس نے مرض کی حالت میں دونوں کو آزاد کر دیا۔ اگر ورثار اجازت دے دیں تو دونوں آزاد ہوں گے ورنہ مریض کے ترکے کی تہائی یعنی ایک ہزار درہم ان دونوں کو ملے گا۔ جس غلام کی قیمت دو ہزار ہے اسے تہائی سے دو حصے ملیں گے اور باقی رقم کے لیے سعایت کرے گا۔ ہزار درہم قیمت والے کو ایک حصہ ملے گا۔ اور باقی کے لیے سعایت کرے گا۔ (عینی شرح ہدایہ)

دراہم مرسلہ کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص کا ترکہ تین ہزار درہم ہے۔ اس نے دراہم کی تعیین کیے بغیر ایک شخص کے لیے دو ہزار درہم

کی اور دوسرے کے لیے ایک ہزار درہم کی وصیت کی۔ لیکن ورثاء نے
تہائی سے زائد مقدار کی اجازت نہ دی۔ تو یہ تہائی ان کے درمیان ۲:۱
میں تقسیم ہوگی)۔

اختلافی مسئلہ میں صاحبینؒ کی دلیل یہ ہے کہ اس طرح کی وصیت میں
موصی دو چیزوں کا ارادہ کرتا ہے ایک تو موصیٰ لہٗ کے استحقاق کا اور
دوسرے ایک موصیٰ لہٗ کو دوسرے پر فوقیت دینے کا۔ لیکن ورثاء
کے حق کی وجہ سے استحقاق تو ممتنع ہوگیا۔ البتہ ایک موصیٰ لہٗ کو دوسرے
پر فوقیت دینے سے کوئی امر مانع نہیں۔ لہٰذا ایک کی دوسرے پر
تفضیل ثابت ہوگی۔ جیسے بیع محابات میں ہوتی ہے اور اس کی
دونوں نظیروں لیو، سعایت اور دراہم مطلقہ ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ ورثاء کی طرف سے تہائی سے زائد
کی اجازت نہ دینے کی بنا پر یہ وصیت غیر مشروع طور پر واقع ہوئی
ہے۔ کیونکہ اس وصیت کا کسی حال میں نفاذ نہیں ہوسکتا لہٰذا یہ
اصل کے لحاظ سے باطل ہو جائے گی اور ایک دوسرے پر تفضیل
و فوقیت تو استحقاق کے ضمن میں ثابت ہوتی ہے لہٰذا استحقاق کے
بطلان سے تفضیل بھی باطل ہو جائے گی۔ جیسے کہ وہ محابات جو بیع
کے ضمن میں ثابت ہو (تو بیع کے بطلان سے محابات بھی باطل ہو جاتی ہے)
بخلاف ان تین صورتوں کے جن میں سب کا اتفاق و اجماع ہے (یعنی
محابات، سعایت اور دراہم مرسلہ کی صورتوں میں بالاتفاق تمام ائمہ اس موصیٰ لہٗ

کے لیے جس کے لیے تہائی سے زائد کی وصیت کی گئی ہے بنظر استحقاق تفاضل کا اعتبار کرتے ہیں) کیونکہ ان تینوں صورتوں میں ورثاء کی اجازت کے بغیر بھی فی الجملہ نفاذ موجود ہے بایں طور کہ مال میں وسعت و گنجائش ہو (مثلاً کہیں اور سے مال مل جائے یا کسی پوشیدہ مال کا اظہار ہو جائے) تو تفاضل کا اعتبار کیا جاتا ہے کیونکہ یہ فی الجملہ مشروع ہے بخلاف مسئلہ کتاب کے کہ وہ کسی طرح مشروع نہیں (یعنی ان تین مسائل میں وصیت فی الجملہ مشروع ہے۔ تو بنظر استحقاق تفاضل کا اعتبار ہوگا اور مسئلہ کتاب میں وصیت مشروع نہیں لہذا تفاضل کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ اس لیے وصیت کی تہائی دونوں میں برابر تقسیم ہوگی)

(جاننا چاہیے کہ تفاضل کا اعتبار صرف دراہم مرسلہ کی صورت میں ہے جن میں کوئی تعیین نہیں ہوتی) بخلاف ایسی صورت کے کہ جب ترکہ میں سے کسی معین مال کی وصیت کرے (اور اس میں اس طرح کا تفاضل ہو) اور اس معین مال کی قیمت تہائی سے زائد ہو (تو موصی لہ کے حق میں بنظر ورثاء یا دوسرے موصی لہ کے ما بنظر تفاضل کا اعتبار نہ ہوگا) چنانچہ موصی لہ صرف تہائی کے حساب سے مستحق قرار دیا جائے گا اگرچہ مال میں اضافہ کا احتمال بھی ہو کہ جس سے یہ عین وصیت اس کی تہائی بن کر نکلے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں موصی لہ کا حق عین مال سے متعلق ہے اس لیے اگر یہ عین مال تلف ہو جائے اور وصیت کا کوئی دوسرا مال مل جائے تو وصیت باطل ہو جاتی ہے۔ اور دراہم مرسلہ کی وصیت کی صورت میں اگر ترکہ تلف ہو جائے تو پھر دوسرا مال مل جائے تو وصیت

نافذ ہوگی۔ کیونکہ وصیت دراہم مرسلہ کی صورت میں صرف اسی ترکہ سے متعلق نہیں ہوتی جس سے ورثاء کا حق متعلق تھا (سراج الہدایہ)

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا کہ اگر کسی شخص نے اپنے بیٹے کے حصے کی وصیت کی (جب کہ بیٹا زندہ ہے) تو وصیت باطل ہے۔ اگر بیٹے کے حصے کے مثل کی وصیت کی تو جائز ہے (اگر اس کے بیٹے کا حصہ ترکہ کی تہائی کے برابر ہے تو وصیت نافذ ہوگی اور اگر تہائی سے زائد ہے تو ورثاء کی اجازت پر موقوف ہوگی) کیونکہ پہلی صورت میں غیر کے مال کی وصیت ہے (اور غیر کے مال میں وصیت کرنا جائز نہیں ہوتا) کیونکہ بیٹے کا حصہ تو وہ ہے جو اسے باپ کی موت کے بعد بطور میراث ملے گا اور دوسری صورت میں بیٹے کے حصے کی مثل کی وصیت ہے۔ اور کسی چیز کا مثل اس کا غیر ہوتا ہے اگرچہ مثل کا اندازہ اسی چیز سے کیا جاتا ہے لیکن ایسی وصیت جائز ہوگی۔

امام زفرؒ پہلی صورت میں بھی جواز کے قائل ہیں امام زفرؒ نے فی الحال یعنی موجودہ حالت کا لحاظ کیا اور فی الحال تمام مال موصی کی ملکیت ہے (لہذا غیر کے مال کے ساتھ وصیت نہ ہوئی) اس کا جواب وہی ہے جو ہم مذکورہ سطور میں دے چکے ہیں۔

مسئلہ: امام قدوریؒ نے فرمایا۔ اگر کسی شخص نے اپنے مال سے ایک سہم (یعنی ایک حصہ میراث) کی وصیت کی تو وارثوں کے حصوں میں سے کمتر حصے کے مطابق اسے دیا جائے گا۔ البتہ اگر موصی لہٗ کا

حصہ چھٹے حصے سے کم ہو تو اس کے لیے چھٹا حصہ پورا کر دیا جائے گا۔ اور اس پر اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ یہ امام ابو حنیفہ رح کی رائے ہے۔

صاحبین رح نے فرمایا کہ موصی لہٗ کے ورثاء کے حصوں میں سے ایک حصے کے برابر ہو گا یعنی جو کمتر حصہ ہے لیکن حصے کی تکمیل کے لیے تہائی پر اضافہ نہیں کیا جائے گا ہاں اگر ورثاء اجازت دے دیں۔ کیونکہ سہم سے مراد عرف میں ورثاء کے حصوں میں سے ایک حصہ ہوتا ہے۔ خصوصاً وصیت میں (جو کہ میراث کی بہن ہے) اور کمتر حصہ یقینی ہوتا ہے تو یہ لفظ اسی طرف پھیرا جائے گا۔ لیکن جب یہ حصہ تہائی سے بڑھ جائے تو اضافہ ورثاء کی طرف پھیر دیا جائے گا۔ کیونکہ ورثاء کی اجازت کے بغیر ثلث پر اضافہ جائز نہیں ہوتا۔

امام ابو حنیفہ رح کی دلیل یہ ہے کہ سہم چھٹے حصے کو کہا جاتا ہے۔ ابن مسعودؓ سے یونہی روایت کیا گیا ہے اور انھوں نے یہ چیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً بیان کی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عموماً سہم بول کر چھٹا حصہ مراد لیا جاتا ہے۔ ایاس بن معاویہ قاضی بصرہ کا کہنا ہے کہ لغت میں سہم چھٹے حصے کو کہا جاتا ہے اور کبھی سہم کا ذکر کر کے ورثاء کے حصوں میں سے کوئی حصہ مراد لیا جاتا ہے لہٰذا جو ہم نے ذکر کیا (یعنی کمتر حصہ) وہی دیا جائے گا۔

مشائخ نے فرمایا کہ یہ بات اہل کوفہ کے عرف میں تھی لیکن ہمارے عرف میں سہم کا لفظ جزء کے لیے استعمال ہوتا ہے لہٰذا سہم اور جزء

کا حکم یکساں ہوگا۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا۔ اگر موصی نے اپنے مال کی ایک جزء کی وصیت کی تو ورثاء سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم چاہتے ہو دے دو۔ کیونکہ لفظِ جزء مجہول ہے جو قلیل و کثیر کو شامل ہے۔ البتہ اس قدر جہالت صحتِ وصیت سے مانع نہیں۔ اور ورثاء موصی کے قائم مقام ہیں لہٰذا جزء کے بیان کا مدار انہی پر ہوگا۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا۔ ایک شخص نے کہا کہ میرے مال کا چھٹا حصہ فلاں شخص کے لیے ہے پھر اسی مجلس میں یا دوسری مجلس میں کہا کہ فلاں شخص کے لیے میرے مال کی تہائی ہے اور ورثاء نے بھی اجازت دے دی تو موصیٰ لہٗ کو مال کی تہائی ملے گی اور سدس بھی اس میں داخل ہو جائے گا۔

اور جس شخص نے کہا کہ میرے مال کا چھٹا حصہ فلاں شخص کے لیے ہے، پھر اسی مجلس میں یا دوسری مجلس میں کہا کہ اس کے لیے میرے مال کا چھٹا حصہ ہے تو اسے ایک سدس ہی ملے گا۔ کیونکہ موصی نے سدس کو معرفہ صورت میں مال کی طرف مضاف کرتے ہوئے ذکر کیا ہے۔ اور جب معرفہ کو دوبارہ استعمال کیا جائے تو دوسرے سے مراد پہلا ہی ہوتا ہے۔ لغت میں یہی معہود ہے۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا جس شخص نے اپنے تہائی دراہم یا تہائی بکریوں کی وصیت کی۔ پھر دراہم یا بکریوں کی دو تہائیاں تلف

ہوگئیں اور ایک تہائی باقی رہ گئی۔ اور موصی کے باقی ماندہ مال کی تہائی یا اس سے کم میں اس کو نکالا جا سکتا ہے (یعنی ان دراہم اور بکریوں کے علاوہ موصی کا جو دوسرا مال ہے یہ باقی ماندہ مقدار اس کے مال کا تہائی یا اس سے کم ہے۔ سراج) تو موصی لہٗ کے لیے باقی ماندہ کل مقدار ہوگی۔

امام زفرؒ نے فرمایا کہ اس کو مابقی کا ثلث ملے گا۔ کیونکہ تلف ہونے والا اور باقی رہنے والے مال ورثاء اور موصی لہٗ کے درمیان مشترک ہے اور مال مشترک کا یہ حکم ہے کہ جس قدر تلف ہو جائے شراکت کے مطابق تلف ہوتا ہے (یعنی ہر شریک کا حصہ تلف ہوتا ہے) اور جو باقی رہے وہ شرکت پر باقی رہتا ہے اور یہ صورت ایسے ہوگی جیسا کہ ترکہ میں مختلف اجناس ہوں (مثلاً ایک شخص کے پاس بکریاں۔ گائیں اور اونٹ ہیں۔ ان میں سے اونٹ اور بکریاں ضائع ہوگئیں صرف گائیں باقی رہیں تو موصی لہٗ کو ان سے تہائی ملے گی)

ہماری دلیل یہ ہے کہ جنس واحدہ میں ایک حق دار کا حق ایک جگہ جمع کرنا ممکن ہے لہٰذا جنس واحدہ میں تقسیم پر جبر کیا جا سکتا ہے۔ (یعنی اگر جنس واحدہ کے شرکاء میں سے ایک شریک تقسیم چاہے تو دوسروں کو تقسیم پر مجبور کیا جا سکتا ہے) اور تقسیم کا مطلب یہی ہے کہ حق شائع یعنی مشترک کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔ اور وصیت کو میراث پر تقدم حاصل ہوتا ہے تو ہم نے وصیت کو باقی ماندہ ایک مقدار میں جمع کر دیا۔ اور جملہ دراہم بمنزلہ درہم واحد ہوگئے (مثلاً اگر موصی کے پاس تین درہم

ہوتے وہ ایک کی وصیت کرنا۔ دو درہم ضائع ہو جاتے ایک باقی رہ جاتا اگر وہ درہم موصی کے باقی مال کی تہائی ہے تو وہ درہم وصیت میں دے دیا جاتا اسی طرح زیر بحث صورت میں دراہم کی تہائی مقدار وصیت میں دی جائے گی۔ سراج) اجناس مختلفہ کی صورت اس سے مختلف ہے کہ انھیں ایک میں جمع و یکجا کرنا ممکن نہیں جبراً تقسیم کرنے کے طور پر اسی طرح اس کو وصیت میں بھی مقدم نہیں کر سکتے۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا۔ اگر ایک شخص نے اپنے تہائی کپڑوں کی وصیت کی۔ ان کپڑوں کے دو تہائی ضائع ہو گئے اور ایک تہائی باقی رہ گیا اور یہ باقی ماندہ مقدار اس کے کل ترکہ کی تہائی ہو سکتی ہے موصیٰ لہٗ ان باقی ماندہ کپڑوں سے صرف ایک تہائی کا مستحق ہوگا۔ مشائخ نے فرمایا کہ یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ کپڑے مختلف اجناس سے ہوں۔ اگر تمام کپڑے ایک ہی جنس سے ہوں تو ان کا حکم دراہم کی طرح ہوگا۔ ہر مکیلی اور موزونی چیز کا بھی یہی حکم ہوگا۔ (یعنی دراہم جیسا) کہ ان اشیاء میں شرکاء میں سے ایک کے حق کو یکجا کرنے کے لیے تقسیم پر جبر جاری ہوتا ہے۔

مسئلہ:۔ اگر ایک شخص نے اپنے تین غلاموں میں سے تہائی کی وصیت کی۔ دو غلام مر گئے تو موصیٰ لہٗ کے لیے باقی کا ثلث ہوگا۔ مختلف گھروں کی وصیت کا بھی یہی حکم ہے۔ بعض حضرات نے کہا کہ یہ امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے۔ کیونکہ امامؒ غلاموں اور مختلف گھروں کے سلسلے میں جبراً تقسیم

کے قائل نہیں (کیونکہ ہر گھر اور ہر غلام کی مالیت مختلف ہوتی ہے) بعض حضرات نے کہا کہ یہ سب کا قول ہے۔ کیونکہ صاحبینؒ کے نزدیک قاضی کو اختیار ہے کہ اپنے اجتہاد سے ایک جگہ جمع کر دے۔ اس کے علاوہ جمع کرنا متعذر ہے۔ قولِ اول فقہ مذکورہ کے زیادہ قریب ہے۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا۔ ایک شخص نے دوسرے کے لیے ایک ہزار درہم کی وصیت کی۔ موصی کا کچھ مالِ عین اور کچھ اس کا دوسرں پر قرض ہے اگر یہ ہزار درہم اس کے مال عین سے تہائی کی مقدار جتنے ہوں تو موصٰی لہٗ کو ادا کر دیے جائیں گے کیونکہ کسی کمی کے بغیر ہر حقدار کو اس کا حق پہنچایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا یہی صورت اختیار کی جائے گی۔ اگر موجودہ مالِ عین میں سے ایک ہزار درہم نہ نکل سکیں تو موصٰی لہٗ کو نقد مال کا ایک تہائی دی جائے گی اور جتنی رقم قرض سے وصول ہوتی رہے گی۔ موصٰی لہٗ کو اس کا تہائی ملتا رہے گا یہاں تک کہ موصٰی لہٗ کا حق پورا ہو جائے۔ کیونکہ موصٰی لہٗ میت کے ترکہ میں ورثاء کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ اگر نقد مال میں موصٰی لہٗ کی تخصیص کر دی جائے تو اس میں ورثاء کا نقصان ہے کیونکہ عین مال کو قرض پر فوقیت ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرض موجودہ حالت میں علی الاطلاق مال نہیں۔ بلکہ وصولی کے بعد اسے مال کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ پس معتدل صورت وہی ہے جو ہم نے ذکر کی۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا۔ ایک شخص نے زید اور عمرو کے لیے

تہائی مال کی وصیت کی۔ لیکن عمرو اس وقت مرا ہوا تھا تو پوری تہائی زید کو ملے گی۔ کیونکہ مرے ہوئے میں وصیت کیے جانے کی اہلیت موجود نہیں پس وہ اس زندہ کے مزاحم نہ ہوگا جو اہلِ وصیت ہے۔ جیسا کہ زید اور دیوار کے لیے وصیت کرے (تو زید کو پوری تہائی ملے گی)

امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ یہ صورت اس وقت ہے کہ جب موصی کو عمرو کی موت کا علم نہ ہو تو زید کے لیے ثلث کا نصف ہوگا۔ کیونکہ موصی کے نزدیک عمرو کے لیے بھی وصیت کرنا صحیح ہے (اس لیے کہ اسے عمرو کی موت کا علم نہیں) تو وہ زندہ کے لیے صرف نصف ثلث پر راضی ہے۔ بخلاف اس کے اگر موصی کو عمرو کی موت کا علم ہو (تو زید کو پوری تہائی ملے گی) کیونکہ میت کے لیے تو وصیت لغو ہوتی ہے تو موصی زندہ کے لیے پورے ثلث کے لیے راضی تھا۔

اگر موصی نے کہا کہ میرا تہائی مال زید اور عمرو کے درمیان وصیت ہے حالانکہ زید مرا ہوا ہے تو عمرو کے لیے نصف ثلث ہوگا۔ کیونکہ موصی کے ان الفاظ کا تقاضا یہی ہے کہ ہر موصیٰ لہٗ کے لیے نصف ثلث ہو بخلاف پہلی بیان کردہ صورت کے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جو شخص یوں کہے کہ میرا تہائی مال زید کے لیے ہے اور خاموش ہو جائے تو زید کو پورا ثلث ملے گا۔ اگر کہے کہ میرا ثلث مال فلاں کے درمیان اور سکوت اختیار کر لے تو فلاں شخص ثلث کا مستحق نہ ہوگا۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا۔ ایک شخص نے اپنے تہائی مال کی

وصیت کی لیکن فی الحال اس کے پاس کوئی مال نہیں۔ بعد ازاں اس نے مال کمایا تو موصیٰ لہٗ اس میں ثلث کا مستحق ہوگا جس مال کا موصی موت کے وقت مالک ہے۔ کیونکہ وصیت ایک عقدِ استخلاف یعنی خلیفہ بنانے کا عقد ہے جو ما بعد الموت کی طرف منسوب ہوتا ہے اور اس کا حکم بھی موت کے بعد ثابت ہوتا ہے لہٰذا موت کے وقت مال کا موجود ہونا شرط ہوگا پہلے نہ ہوگا۔

اسی طرح موصیٰ لہٗ ثلث کا حقدار ہوگا جبکہ موصی کے پاس مال ہو اور تلف ہو جائے پھر وہ کچھ مال کمائے اس کی دلیل ہم نے بیان کر دی ہے۔

اگر موصی بکریوں کے ثلث کی وصیت کرے اور بکریاں اس کی موت سے پہلے مر جائیں یا موصی کے پاس کوئی بکری ہی نہ ہو تو ہمارے مذکورہ استدلال کی بناء پر یہ وصیت باطل ہوگی۔ کیونکہ وصیت نام ہے ایجاب بعد الموت کا۔ اس لیے مال کے قیام کا موت کے وقت اعتبار ہوگا۔ اور یہ وصیت مالِ عین سے متعلق ہے لہٰذا موت کے وقت مالِ عین کے موجود نہ ہونے سے وصیت باطل ہوگی۔

اگر وصیت کے وقت موصی کے پاس بکریاں نہ ہوں پھر اس نے کچھ بکریاں حاصل کر لیں اور مر گیا تو صحیح قول کے مطابق وصیت صحیح ہوگی۔ کیونکہ اگر وصیت لفظِ مال کے ساتھ ہوتی تو صحیح ہوتی۔ اسی طرح جب مال کی ایک قسم کا ذکر کر دیا گیا تو بھی صحیح ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موصی

کی موت سے پہلے بکریوں کا موجود ہونا ایک زائد امر ہے (اس کو وصیت کی صحت سے تعلق نہیں ہوتا) معتبر امر تو یہ ہے کہ موصی کی موت کے وقت مال موجود ہو۔

اگر موصی نے کہا کہ فلاں شخص کے لیے میرے مال سے ایک بکری ہے حالانکہ اس کے مال میں کوئی بکری نہیں تو موصٰی لہٗ کو ایک بکری کی قیمت دی جائے گی۔ کیونکہ جب موصی نے موصٰی بہ کو اپنے مال کی طرف مضاف کیا تو ہمیں پتا چلا کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ بکری کی مالیت کی وصیت کی جارہی ہے۔ کیونکہ بکری کی مالیت مطلق مال میں موجود ہے۔

اگر بکری کی وصیت کرے اور اسے اپنے مال کی طرف مضاف نہ کرے اور اس کے پاس کوئی بکری بھی نہ ہو تو کہا گیا کہ وصیت صحیح نہ ہو گی۔ کیونکہ وصیت کو صحیح کرنے والی چیز مال کی طرف اضافت کرنا تھا اور اس اضافت کے بغیر (بکری کی مالیت مراد نہ ہو گی بلکہ) صوری اور معنوی لحاظ سے بکری ہی مراد ہو گی۔

بعض حضرات نے فرمایا وصیت صحیح ہو گی کیونکہ جب اس نے بکری کا ذکر کیا حالانکہ اس کے ملک میں کوئی بکری ہے ہی نہیں تو معلوم ہوا کہ اس کی مراد بکری کی مالیت ہے۔

اگر کہا کہ میں بکریوں سے ایک بکری کی وصیت کرتا ہوں اور اس کے پاس بکریاں نہیں ہیں تو وصیت باطل ہو گی کیونکہ جب اس نے بکریوں کی طرف اضافت کی تو پتہ چلا کہ اس کی مراد عین بکری ہے۔ اس

لیے کہ اس نے عین شاۃ کو بکریوں کے گلہ کا جزو بتایا ہے۔ بخلاف اس کے جب وہ مال کی طرف مضاف کرے اس اصول پر بہت سے مسائل کی تخریج کی جا سکتی ہے۔

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا۔ ایک شخص نے اپنے مال کی تہائی کی وصیت کی اپنی امہات الاولاد کے لیے جو کہ تین ہیں اور فقراء و مساکین کے لیے۔ تین ام ولد پانچ حصوں میں سے تین حصے لیں گی۔ (اور فقراء و مساکین کو ایک ایک حصہ)

مصنف علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں یہ امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کا نظریہ ہے۔ الجامع الصغیر کے علاوہ دوسری روایت میں امام محمدؒ سے مروی ہے کہ وصیت کو سات حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ ام ولد کے تین حصے اور فقراء و مساکین میں سے ہر فریق کے دو حصے ہوں گے۔ اس مسئلہ کا اصل یہ ہے کہ امہات الاولاد کے لیے وصیت جائز ہوتی ہے فقراء اور مساکین دو الگ الگ جنس ہیں۔ اس کی تفسیر ہم کتاب الزکوٰۃ میں بیان کر چکے ہیں۔

امام محمدؒ کی دلیل یہ ہے یہ الفقراء والمساکین لفظ جمع کے طور پر مذکور ہے اور جمع کے میراث میں کم سے کم دو فرد مراد ہوتے ہیں۔ یہ بات ہمیں قرآن کریم سے معلوم ہوتی ہے (ارشادِ الٰہی ہے فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ یہاں لفظ اخوہ اگر جمع ہے مگر اس سے دو بہنیں مراد ہیں)۔

شیخینؒ کی دلیل یہ ہے کہ جو جمع معرف باللام ہو اس سے جنس مراد ہوتی ہے (افراد مراد نہیں ہوتے) اور جنس کل افراد کا احتمال رکھنے کے باوجود ادنیٰ فرد پر بھی مشتمل ہوتی ہے (جیسے انسان سے مراد تمام افراد بھی ہو سکتے ہیں اور ایک بھی) خصوصًا اس صورت میں جب کہ تمام افراد کی طرف اس کا پھیرنا متعذر ہو اس لیے ہر فریق میں سے ایک فرد کا اعتبار کیا جائے گا۔ تو تمام افراد کا حساب پانچ تک پہنچے گا۔ (تین ام ولد ایک فقیر اور ایک مسکین) اور تین امہات الاولاد کو تین حصے ملیں گے۔

مسئلہ:- امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا۔ اگر ایک شخص نے فلاں شخص کے لیے اور مساکین کے لیے تہائی مال کی وصیت کی۔ تو نصف تہائی اس کے لیے ہوگی اور نصف تہائی مساکین کے لیے یہ شیخینؒ کے نزدیک ہے۔ امام محمدؒ کے نزدیک وصیت کے تین حصے کیے جائیں گے۔ ایک حصہ اس کو اور دو حصے مساکین کو ملیں گے۔

اگر بصیغۂ جمع مساکین کے لیے وصیت کرے تو شیخینؒ کے نزدیک وہ ایک مسکین پر بھی صرف کر سکتا ہے۔ لیکن امام محمدؒ کے نزدیک وہ کم سے کم دو مساکین پر صرف کرے۔ جانبین کے دلائل ابھی مذکورہ بالا مسئلہ میں بیان کیے گئے ہیں (کہ امام محمدؒ کے نزدیک میراث میں کم از کم دو افراد پر جمع کا اطلاق ہوتا ہے اور شیخینؒ کے نزدیک جمع معرف باللام جنس ہوتی ہے جو ایک فرد پر بھی صادق آتی ہے)۔

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا۔ اگر ایک شخص نے
ایک آدمی مثلاً ا کے لیے ایک سو درہم کی وصیت کی۔ اور دوسرے
شخص مثلاً ب کے لیے بھی سو درہم کی وصیت کی۔ پھر تیسرے شخص مثلاً ج
سے کہا کہ میں نے تجھے ان دونوں کے ساتھ وصیت میں شریک کر لیا ہے
تو ج کے لیے ہر سو میں سے ایک تہائی ہوگا کیونکہ لغوی طور پر شرکت
مساواۃ کے لیے ہوتی ہے۔ اور جو طریق ہم نے بیان کیا ہے اس سے
تینوں میں مساواۃ ثابت کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ مال میں اتحاد پایا جاتا
ہے۔ ان میں ا، ب اور ج تینوں کو سو کے دو دو تہائی مل جائیں گے
بخلاف اس صورت کے کہ جب ایک شخص کے لیے چار سو کی وصیت
کرے اور دوسرے کو دو سو کی اور پھر تیسرے شخص کا اشتراک ہو۔
کیونکہ اس صورت میں تینوں کے درمیان مساواۃ ممکن نہیں۔ اس لیے
کہ دونوں مالوں میں اتحاد نہیں بلکہ تفاوت ہے۔ لہٰذا ہم نے شریک کرنے
کے لفظ کو اس معنی پر محمول کیا کہ تجھے ان دونوں میں سے ہر ایک کے
ساتھ اس طرح برابر کیا جاتا ہے کہ ہر ایک سے اس کی مقدار میں سے
نصف نصف لے لو تاکہ لفظ شرکت پر بقدر امکان عمل ہو سکے۔

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا۔ ایک شخص نے کہا
کہ فلاں آدمی کا مجھ پر قرض ہے پس تم لوگ اس کی تصدیق کرنا۔ اس
کا مطلب یہ ہے کہ موصی کے ورثا سے تصدیق کرنے کو کہا۔ تو تہائی مال
تک تصدیق کی جائے گی۔ یہ استحسان کے پیش نظر ہے۔ قیاس کا تقاضا

تو یہ ہے کہ اس کی تصدیق نہ کی جائے۔ اس لیے کہ مجہول کا اقرار اگرچہ صحیح ہوتا ہے لیکن ایسے اقرار کی بنا پر حکم صادر نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ ساتھ وضاحتی بیان نہ ہو۔ اور اس کا یہ کہنا "کہ تم اس کی تصدیق کرو" مخالف شرع صادر ہوا ہے۔ کیونکہ حجت و شہادت کے بغیر مدعی کی تصدیق نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے اس اقرار کو مطلقاً اقرار ثابت کرنا متعذر ہے۔ پس اس کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔

استحسان کی وجہ یہ ہے ہم جانتے ہیں کہ موصی کا اس اقرار سے مقصد یہ ہے کہ مقرلہ کو اپنے ورثاء پر مقدم کرے۔ اور وصیت کے طریق پر اس کے مقصد کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ اور بسا اوقات ایسے شخص کو اس قسم کے اقرار کی ضرورت درپیش آتی ہے جو کسی کا اصل حق تو اپنے ذمے جانتا ہے لیکن حق کی مقدار کا علم نہیں ہوتا اور وہ اس فکر و سعی میں ہوتا ہے کہ میرا ذمہ اس سے فارغ ہو جائے تو وہ اس حق کو ایسی وصیت کے پیرائے میں بیان کر دیتا ہے جس میں مقدار کا اندازہ موصی لہ کے حوالے کیا جاتا ہے۔ گویا کہ موصی نے یوں کہا کہ جب فلاں شخص تمہارے پاس آئے اور مال میں کسی مقدار کا دعوی کرے تو میرے مال سے جس قدر وہ طلب کرے دے دینا۔ یہ وصیت تہائی ترکہ معتبر ہو گی لہٰذا تہائی مال تک اس کی تصدیق کی جائے گی۔ تہائی سے زیادہ مقدار میں نہیں کی جائے گی۔

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا۔ اگر موصی نے اقرار

مجہول کے علاوہ کچھ اور وصیتیں کیں تو اصحاب وصایا کے لیے مال کی تہائی الگ کر لی جائے گی اور دو ثلث وارثوں کے لیے ہوں گے کیونکہ ان کی میراث تو معلوم ہے۔ اور اسی طرح وصیتیں بھی معلوم ہیں اور اس کا اقرار مجہول تھا۔ مجہول اقرار کسی معلوم کا مزاحم نہیں ہو سکتا۔ تو معلوم حق کے لیے ترکہ سے پہلے الگ کر دیا جائے گا۔ الگ کرنے میں ایک اور فائدہ بھی ہے کہ دونوں فریقوں یعنی ورثاء اور صاحب وصایا میں سے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک فریق کو اس مجہول اقرار کی مقدار کی زیادہ آگاہی اور بصارت ہوتی ہے۔ اور دوسرا فریق شاید دیدہ و دانستہ نزاع و خصومت سے کام لے رہا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ جب صاحب دین اپنے حق کا دعویٰ کرے تو دونوں فریق زیادتی مقدار میں جھگڑا کریں اور ہر فریق کا حصہ الگ کرنے کے بعد ہر فریق کے قبضہ میں جو مال ہے اس میں وہ جو اقرار کرے دوسرے کے نزاع کے بغیر وہ اقرار صحیح رہے گا۔

جب مال کو الگ الگ کر لیا جائے تو اصحاب وصایا سے کہا جائے گا کہ تم اس شخص کے دعوے میں جس کی نسبت مجہول اقرار کیا گیا ہے جس مقدار تک چاہو تصدیق کر لو اور ورثاء سے کہا جائے گا کہ تم بھی جس مقدار میں چاہو اس کی تصدیق کرو کیونکہ یہ تو مستحق کے حق کے لحاظ سے قرض ہے (اور قرضہ کل ترکہ میں ہوتا ہے اور میراث سے مقدم ہوتا ہے) اور نافذ کرنے کے لحاظ سے وصیت ہے۔ الغرض جب ہر فریق کسی مقدار کا اقرار کرے گا تو یہ بات ظاہر ہو جائے گی

کہ میت کے ترکہ میں کسی شخص کا ایسا قرضہ ہے جو دونوں حصوں (یعنی ترکہ اور وصیت) میں پھیلا ہوا ہے۔ پس تہائی والوں سے ان کے اقرار کی مقدار کا تہائی لیا جائے گا (مثلاً انھوں نے کہا کہ اس کا قرض نو سو درہم ہے تو تین سو یعنی بقدر تہائی ان سے لیا جائے گا) اور وارثوں نے جو اقرار کیا ہے ان سے اس کا دو تہائی لیا جائے گا تاکہ ہر فریق کا اقرار اس کے حق کی مقدار میں نافذ ہو۔ اگر مدعی یعنی مقر لہ نے اس سے زائد کا دعوی کیا تو فریقین میں سے ہر ایک فریق کے ذمہ اپنے علم پر قسم کھانا ضروری ہوگا۔ کیونکہ ہر فریق سے ایسے امر پر قسم لی جاتی ہے جو مدعی اور دوسرے شخص یعنی میت کے درمیان جاری ہوا۔

مسئلہ: امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا۔ اگر کسی شخص نے ایک اجنبی اور ایک وارث کے لیے کسی مقدار کی وصیت کی۔ تو اجنبی کے لیے نصف وصیت ہوگی اور وارث کے لیے وصیت باطل ہوگی۔ کیونکہ اس شخص نے ایسی وصیت کی جس کا وہ مجاز ہے لیکن ساتھ ہی ایسی وصیت بھی کی جس کا مجاز نہیں ہے۔ تو پہلی صورت میں وصیت صحیح ہوگی اور دوسری میں باطل۔ بخلاف اس کے اگر وہ ایک زندہ اور ایک مردہ شخص کے لیے وصیت کرے (تو ساری وصیت زندہ کے لیے ہوگی کیونکہ مردہ وصیت کا اہل نہیں ہوتا اور وہ زندے کا مزاحم نہیں بن سکتا۔ لہٰذا وصیت کی پوری مقدار زندہ کے لیے ہوگی۔ وارث میں وصیت کی اہلیت ہوتی ہے۔ اور یہ وصیت باقی وارثوں کی اجازت سے صحیح ہو سکتی ہے

پس دونوں میں فرق واضح ہوگیا۔ اسی طرح جب اپنے قاتل اور اجنبی کے لیے وصیت کی (تو اجنبی کو نصفِ وصیت ملے گا اور قاتل کے لیے باطل ہوگی)۔

یہ حکمِ وصیّت اس صورت کے خلاف ہے کہ موصی جب ایک اجنبی اور وارث کے لیے مالِ عین یا دین یعنی درہم و دینار کا اقرار کرے تو یہ اقرار اجنبی کے حق میں بھی صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ وصیت تو انشاءِ تصرف کا نام ہے اور موصٰی لہما یعنی اجنبی اور وارث کے درمیان شرکت اس پر مرتب ہونے والے احکام سے ایک حکم ہے۔ لہٰذا اجنبی اور وارث میں سے جو بھی وصیت کا مستحق ہوگا اس کے حق میں وصیت ثابت ہوجائے گی۔ جہاں تک اقرار کا معاملہ ہے اقرار ایسے امر کے بارے میں خبر دینا ہوتا ہے جو پہلے ہوچکا ہے۔ اور اس نے زمانۂ ماضی میں اس مالِ عین یا دین میں وصفِ شرکت کی خبر دی۔ اور اس بات کی کوئی وجہ نہیں کہ وصفِ شرکت کے بغیر اجنبی کے حق میں یہ اقرار ثابت کیا جائے (کہ اجنبی اکیلا ہی اس عین یا دین کا مالک بن جائے) کیونکہ ایسا اقرار تو خبر دینے کے خلاف ہے اور نہ شرکت کے اس وصف کو ثابت کرنے کی کوئی صورت ہے۔ کیونکہ اس طرح تو وارث بھی وصیت میں شریک ہوجاتا ہے (اور یہ ممکن نہیں)۔

دوسری بات یہ ہے (کہ شرکت کے بعد اجنبی کے حق میں اقرار صحیح نہیں ہوتا بلکہ بے فائدہ ہے) کیونکہ اگر اجنبی نے اپنا کچھ حصہ وصولی

کر لیا تو وارث کو اس میں شرکت کا اختیار ہوگا۔ لہذا اس مقدار کی وصولی باطل ہو گی۔ اور پھر یہی ہوتا رہے گا کہ اجنبی جو کچھ وصول کرتا رہے گا وارث اس میں شریک ہوتا رہے گا یہاں تک کہ کل باطل ہو جائے گا لہذا اجنبی کے ساتھ وارث کو شریک بنانے کا اقرار ہرگز مفید نہ ہوگا۔ اور انشاءِ وصیت کی صورت میں ایک کا حصہ دوسرے سے ممتاز و علیحدہ ہوتا ہے باقی رہنے کے لحاظ سے اور باطل ہونے کے لحاظ سے (خلاصہ یہ ہوا کہ وارث اور اجنبی دونوں کا حصہ الگ ہونے کی صورت میں نصف وصیت اجنبی لے گا اور وارث کے حق میں وصیت باطل ہو گی۔ لیکن اقرار کی صورت میں دونوں کا حصہ الگ نہیں رہتا لہذا دونوں کے لیے اقرار باطل ہوگا)۔

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا۔ ایک شخص کے پاس تین کپڑے تھے۔ عمدہ، درمیانہ اور ردی۔ موصی نے ہر ایک کپڑے کی ایک ایک شخص کے لیے وصیت کی۔ ان میں سے ایک کپڑا ضائع ہو گیا اور یہ علم نہ ہو سکا کہ ضائع ہونے والا کپڑا کونسا تھا۔ اعلیٰ، درمیانہ یا ادنیٰ۔ اور ورثاء اس سے انکار کرتے ہیں تو وصیت باطل ہو گی۔ ورثاء کے انکار کا یہ مطلب ہے کہ وارث ہر موصی لہٗ سے کہتا ہے کہ جس کپڑے میں تیرا حق تھا وہی ضائع ہوا ہے تو موصی لہٗ کا حق مجہول ہو گیا۔ حق کی جہالت صحت قضاء و فیصلہ سے بھی مانع ہوتی ہے اور مقصد بھی حاصل نہیں ہو سکتا لہذا وصیت باطل ہو گی۔

مسئلہ :- امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا۔ اگر وارث دونوں باقی ماندہ کپڑے سپرد کردیں (یعنی تینوں موصی لہم کے حوالے کردیں) جب ورثاء وہ کپڑے موصی لہم کے سپرد کردیں گے تو مانع زائل ہوگیا اور وہ مانع ورثاء کا انکار تھا۔ پس عمدہ کپڑے کے موصی لہٗ کے لیے ان میں سے عمدہ کپڑے سے دو تہائیاں ہوں گی۔ اور درمیانہ کپڑے کے موصی لہٗ کے لیے اچھے کپڑے کی ایک تہائی ہوگی اور گھٹیا کپڑے کی ایک تہائی ہوگی۔ اور ردی کپڑے کے موصی لہٗ کے لیے ردی کپڑے کے دو ثلث ہوں گے۔ کیونکہ اعلیٰ کپڑے کے موصی لہٗ کا یقینی طور پر ردی کپڑے میں کوئی حق نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دو کپڑوں میں جو ردی ہے وہ شاید تینوں کپڑوں میں درمیانہ درجے کا ہو یا کمتر درجے کا اور اس کا ان دونوں یعنی وسط اور ردی میں کوئی حق نہیں (لہٰذا وہ دونوں میں سے اعلیٰ قسم سے دو ثلث لے گا) اور ردی کپڑے کے موصی لہٗ کا باقی کے اعلیٰ تھان میں کوئی حق یقینی طور پر نہیں۔ کیونکہ دو میں سے اعلیٰ کپڑا یا تو اعلیٰ درجے کا ہے یا درمیانہ درجے کا اور اس کا ان دونوں میں کوئی حق نہیں (لہٰذا وہ ردی کپڑے کے دو ثلث لے گا) دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ ان دو کپڑوں میں جو ردی ہے شاید یہی واقعتہً ردی ہو۔ پس ردی کے موصی لہٗ کو اسی کپڑے سے جو محتمل ہے دیا جائے گا۔

جب دونوں کپڑوں سے اعلیٰ قسم سے دو ثلث تقسیم ہوگئے

اور ردی سے بھی دو ثلث جلتے رہے تو اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں کا ایک ایک ثلث باقی رہ گیا۔ تو درمیانہ درجے کے موصیٰ لہٗ کے لیے مجبوری اور ضرورت کے مدنظر یہی دو ثلث متعین ہو گئے۔

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا۔ اگر ایک مکان دو شخصوں میں مشترک ہو۔ ان میں سے ایک شخص ایک معین کمرے کی کسی شخص کے لیے وصیت کرے اور مر جائے تو اس مکان کی تقسیم کی جائے گی۔ اگر وہ کمرہ موصی کے حصہ میں آ گیا تو موصیٰ لہٗ کو مل جائے گا یہ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ہے۔ امام محمدؒ نے فرمایا کہ موصیٰ لہٗ کے لیے نصف کمرہ ہو گا۔

اور وہ کمرہ موصی کی بجائے دوسرے شریک کے حصے میں آ گیا۔ تو موصیٰ لہٗ کے لیے وصیت کردہ کمرے کی پیمائش کے مطابق جگہ ہو گی۔ یہ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کی رائے ہے۔ امام محمدؒ نے فرمایا کہ موصیٰ لہٗ کو کمرے کی نصف پیمائش کے مطابق جگہ ملے گی۔

امام محمدؒ کی دلیل یہ ہے کہ موصی نے اپنی ملکیت کے ساتھ غیر کی ملکیت کی بھی وصیت کی کیونکہ مکان اپنے تمام اجزاء کے ساتھ دونوں شریکوں میں مساوی مشترک ہے تو وصیت کا پہلا حصّہ جو اس کی اپنی ملکیت میں تھی نافذ ہو گا اور دوسرا حصّہ جو غیر کی ملک ہے اس کے مالک کی اجازت پر موقوف ہو گا۔

موصی اگرچہ وصیت کے بعد بذریعہ تقسیم کے جو ایک قسم کا مبادلہ

ہے اس معین کمرے کا مالک ہو گیا تو بھی سابقہ وصیت نافذ نہ ہو گی۔ جیسے کہ کسی دوسرے کی مملوکہ چیز کی وصیت کردے اور بعد میں اسے خرید لے (تو وصیت صحیح نہیں ہوتی)

پھر ورثاء موصی نے جب اس مکان کو تقسیم کرالیا اور موصی بہ کمرہ موصی کے حصے میں آگیا تو وصیت صرف اس چیز میں نافذ ہو گی جو بعینہ موصی بہ ہے اور وہ نصف کمرہ ہے۔ اگر وہ معین کمرہ دوسرے شریک کے حصہ میں آگیا تو موصی لہٗ کو نصف کمرے کی پیمائش کے مطابق جگہ ملے گی۔ اس کی وصیت کے نفاذ کے لیے موصی بہ کے عوض میں جب کہ موصی بہ معدوم ہو جائے۔ جیسے کسی شخص کے لیے اپنی باندی کی وصیت کی اور باندی خطاً قتل کردی گئی تو موصی لہٗ کو جاریہ کا بدل یعنی دیت سے قیمت دی جائے گی تاکہ وصیت نافذ ہو۔

بخلاف اس کے اگر وصیت کردہ غلام کو موصی فروخت کردے تو اس کی قیمت سے وصیت متعلق نہ ہو گی۔ اس لیے کہ بیع پر اقدام وصیت کو باطل کر دیتا ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ تقسیم کرنے سے وصیت باطل نہیں ہوتی۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کی دلیل یہ ہے کہ موصی نے ایسی چیز کی وصیت کی جس پر تقسیم کے ذریعے اس کی پوری ملکیت برقرار اور پختہ ہو جائے گی۔ کیونکہ ظاہر یہی ہے کہ انسان ایسی مملوک چیز کی وصیت کرتا ہے جو ہر لحاظ سے قابلِ انتفاع ہو اور اس قسم کا انتفاع

تقسیم کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ مشترکہ چیز سے انتفاع ناتمام اور قاصر ہوتا ہے۔ جب تقسیم کے بعد معین کمرہ اس کے حصہ میں آگیا تو پورے کمرے پر اس کی ملکیت متقرر ہو گئی اور اس میں وصیت نافذ ہو گی۔ اور مبادلہ کے معنی اس تقسیم میں تابع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تقسیم کا مقصد تو حصے کا الگ کرنا ہے تاکہ منفعت کی تکمیل ہو سکے۔ اسی بناء پر مشترکہ چیز کی تقسیم پر شرکاء کو مجبور کیا جاتا ہے۔ اس علیحدگی اور انفراد کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسا ہو گیا گویا کہ وہ شخص اس کمرے کا پہلے ہی مالک ہے۔

اگر یہ کمرہ دوسرے شریک کے حصے میں آئے تو کمرے کی پیمائش کے مطابق جگہ میں وصیت نافذ ہو گی۔ اس جگہ میں سے جو موصی کے حصے میں آئی ہے۔ یا تو اس لیے کہ کمرے کی بجائے جو قطعۂ زمین ملا وہ کمرے کا عوض ہے۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ یا اس لیے کہ کمرے کے ذکر سے موصی کی مراد یہ تھی کہ اس کمرے کے برابر موصیٰ لہ کو قطعۂ زمین دیا جائے تاکہ حتی الامکان موصی کا مقصد پورا ہو سکے۔ البتہ اتنی بات ہے کہ کمرہ موصی کے حصہ میں آجائے تو اسی کمرے کا دینا متعین ہو گا تاکہ بیان کردہ دونوں جہتوں پر عمل ہو سکے۔ یعنی اندازہ اور بعینہٖ ملکیت (یعنی اس کمرے کے بقدر یا بعینہٖ مملوک کمرہ دینا۔ اور متعین کمرہ دینے میں یہ دونوں باتیں پوری ہو جاتی ہیں)

اگر کمرہ دوسرے حصے میں آیا تو ہم نے اندازے کی جہت پر عمل

کیا۔ یا ہم کہتے ہیں کہ موصی نے خود دونوں وجہوں میں سے ایک کے اعتبار پر اس کمرے کے ذکر سے اندازے کا ارادہ کیا ہے اور دوسری وجہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے (جب کہ کمرہ اس کے حصہ میں آئے) تملیک کا ارادہ کیا ہے کہ موصی لہ کو یہی کمرہ دے دے گا۔ جیسا کہ کسی شخص نے بچے کی آزادی اور زوجہ کی طلاق کو باندی کے پہلا بیٹا جننے سے معلق کیا (مثلاً کہا کہ جب یہ میری باندی شوہر سے پہلا بچہ جنے گی تو وہ بچہ آزاد ہے اور میری بیوی کو طلاق ہے) پس وقوع طلاق کے لیے مطلق بچہ مراد ہے اور آزاد ہونے کے لیے زندہ بچہ مراد ہے۔

جب یہ کمرہ موصی کے علاوہ دوسرے کے حصے میں آجائے اور مکان کا رقبہ سو گز ہے اور کمرے کا رقبہ دس گز ہے تو امام محمدؒ کے نزدیک موصی کا حصہ موصی لہ اور وارثوں کے درمیان دس حصوں میں بانٹا جائے گا بایں طور کہ ایک حصہ موصی لہ کے لیے ہوگا اور نو حصے وارثوں کے لیے۔ کمرے سے موصی لہ کا حصہ پانچ گز اور وارثوں کے لیے پانچ گزوں کے سوا نصف مکان یعنی پینتالیس گز ہوگا تو ہر پانچ سہم کا ایک حصہ مقرر کیا گیا اور اس طرح دس سہم ہوں گے۔

شیخینؒ کے نزدیک پچاس گز یعنی نصف مکان کے گیارہ سہم بنائے جائیں گے کیونکہ موصی لہ کا حصہ ان کے نزدیک دس گز کے حساب سے ہوگا اور ورثار کے لیے پینتالیس گز کا حصہ لگایا جائے گا (کیونکہ موصی لہ کا حصہ نکالنے سے باقی نوّے گز رہا جن

میں سے موصی پینتالیس گز کا مالک ہے) تو تمام حصے (بقدر پانچ پانچ کے) گیارہ ہوں گے۔ موصیٰ لہٗ کے دو حصے ہوں گے اور ورثاء کے لیے نو حصے۔

اگر بجائے وصیت کے اقرار ہو (مثلاً ا اور ب میں ایک مکان مشترک ہو۔ ا ج کے لیے ایک معین کمرے کا اقرار کرے) تو بعض حضرات کے نزدیک شیخینؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک اسی طرح اختلاف ہے۔ اور بعض حضرات نے کہا کہ اس صورت میں امام محمدؒ کو بھی کوئی اختلاف نہیں۔ امام محمدؒ کے لیے دونوں میں فرق کی دلیل یہ ہے کہ غیر کی ملکیت کا اقرار صحیح ہوتا ہے حتیٰ کہ جس شخص نے غیر کی ملکیت کا غیر کے لیے اقرار کیا۔ پھر مقر اس چیز کا مالک بن جائے تو مقر کو حکم دیا جائے گا کہ وہ مقر لہٗ کو سپرد کر دے۔ ملکِ غیر کی وصیت کرنا صحیح نہیں حتیٰ کہ موصی اگر کسی وجہ سے اس چیز کا مالک بن گیا اور بعد ازاں مرا تو اس کی وصیت صحیح نہیں ہوتی اور نہ نافذ ہوتی ہے۔

مسئلہ:- امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا۔ مثلاً اگر ا نے ب کے لیے ج کے مال سے معین ہزار درہم کی وصیت کی۔ ج نے ا کی موت کے بعد اجازت دے دی۔ اور یہ مال ب کو دے دیا گیا تو جائز ہوگا اور ج کو اجازت دینے کے بعد روک لینے کا حق بھی ہے۔ کیونکہ موصی کا یہ فعل ایک غیر کے مال سے تبرع ہے لہٰذا اس کی اجازت پر موقوف ہوگا جب غیر نے اجازت دے دی تو اس کی

طرف سے بھی تبرع ہو گا۔ اسے یہ بھی حق ہے کہ وہ سپرد کرنے سے روک دے بخلاف اس صورت کے جب کہ موصی تہائی مال سے زائد کی وصیت کرے اور ورثاء نے اس زائد مقدار کی اجازت دے دی (تو جائز ہو گا اور ورثاء کو یہ زائد مال دینا پڑے گا) کیونکہ وصیت مذکورہ اپنے مخرج میں صحیح طور پر صادر ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ وصیت اس کی ذاتی ملک پر واقع ہوئی ہے۔ اس کے نفاذ میں رکاوٹ ورثاء کے حق کی وجہ سے تھی۔ جب ورثاء نے اجازت دے دی تو ان کا حق ساقط ہو گیا اور وصیت موصی کی جانب سے نافذ ہو گی۔

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا۔ اگر دو بھائیوں نے اپنے باپ کا ترکہ ایک ہزار درہم آپس میں تقسیم کر لیا پھر ایک بیٹے نے اقرار کیا کہ والد صاحب نے فلاں شخص کے لیے تہائی مال کی وصیت کی تھی تو اقرار کرنے والا اس مال سے جو اس کے قبضہ میں ہے ایک تہائی مقرلہٗ کو دے گا یہ استحسان کے پیش نظر ہے۔

قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ جو اس کے قبضہ میں ہے وہ اس کا نصف ادا کرے۔ امام زفرؒ کا یہی قول ہے۔ کیونکہ اس کا موصی کی طرف سے ثلث کا اقرار کرنا اس اقرار کو متضمن ہے کہ موصٰی لہٗ اس کے ساتھ برابر کا مستحق ہے۔ اور برابری نصف مقبوض دینے کی صورت میں متحقق ہو سکتی ہے۔ تاکہ اس کے پاس بھی نصف ہی باقی رہ جائے۔

استحسان کی وجہ یہ ہے کہ اقرار کرنے والے نے ایسی تہائی کا اقرار کیا ہے جو سارے ترکہ میں شائع ہے اور ترکہ ان دونوں کے قبضہ میں ہے تو اقرار کرنے والا اپنے مقبوضہ کی تہائی کا اقرار کرنے والا ہوگا بخلاف اس صورت کے جب کہ ایک بیٹا کسی غیر کے قرض کا باپ پر اقرار کرے (تو قرض تمام ترکہ سے ادا کیا جائے گا) کیونکہ قرض میراث پر مقدم ہوتا ہے۔ تو گویا اقرار کرنے والا اس امر کا بھی اقرار کرتا ہے کہ قرض کو میراث پر فوقیت دی جائے پس قرض کو میراث پر مقدم کیا جائے گا۔ لیکن تہائی کا موصیٰ لہٗ وارث کے ساتھ شریک ہوتا ہے لہٰذا موصیٰ لہٗ کو کوئی چیز نہ دی جائے گی جب کہ ورثاء کے دو تہائی محفوظ و سالم نہ ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اقرار کرنے والے سے اگر مقبوض کا نصف لے لیا جائے تو بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوسرا بھائی بھی اس وصیت کا اقرار کر لیتا ہے اور موصیٰ لہٗ اس کے مقبوض کا نصف بھی لے لے تو اس طرح نصف ترکہ موصیٰ لہٗ کے پاس پہنچ جائے گا اور تہائی سے بڑھ جائے گا۔ حالانکہ یہ اصول کے خلاف ہے۔

مسئلہ: امام قدوری نے فرمایا۔ ایک شخص نے ایک باندی کی دوسرے شخص کے لیے وصیت کی۔ وصی کی موت کے بعد باندی نے بچہ جنا۔ درآنحالیکہ باندی اور بچہ دونوں ترکہ کی تہائی سے نکلتے ہیں تو ماں بیٹا دونوں موصیٰ لہٗ کے لیے ہوں گے۔ کیونکہ ماں تو اصالۃً وصیت

میں داخل ہے۔ اور بچہ تبعاً داخل ہو جائے گا جبکہ وہ اپنی ماں سے متصل تھا پس جب اس نے تقسیم سے پہلے بچے کو جنم دیا جب کہ کل ترکہ میت کی ملکیت پر باقی ہو تب بھی کہ میت کے قرضے اسی غیر منقسم ترکہ سے ادا کیے جاتے ہیں تو بیٹا بھی وصیت میں داخل ہو جائے گا۔ اور دونوں موصیٰ لہ کے لیے ہوں گے۔

اگر دونوں تہائی ترکہ سے نہ نکلتے ہوں تو موصیٰ لہ کی تہائی کا حساب لگایا جائے گا اور صاحبینؒ کے قول کے مطابق موصیٰ لہ کا جو حصہ تہائی سے سے نکلتا ہے وہ ان دونوں سے لے گا (یعنی ہر ایک سے بقدر نصف تہائی)۔

امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ موصیٰ لہ پہلے تہائی حصہ ماں سے لے گا اور جو باقی بچا وہ بچے سے لے گا۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں ایک صورت متعین کی ہے کہ ایک شخص کے پاس چھ سو درہم اور ایک باندی ہے جس کی قیمت تین سو درہم کے برابر ہے اس نے ایک شخص کے لیے باندی کی وصیت کی اور موصی مر گیا پس باندی نے تقسیم سے پہلے ایک بچہ جنا جس کی قیمت تین سو درہم کے برابر ہے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک موصیٰ لہ کے لیے پوری باندی اور بچے کا ثلث ہوگا اور صاحبینؒ کے نزدیک ان دونوں میں سے ہر ایک کا دو تہائی ہوگا۔

صاحبینؒ کی دلیل ہوئی ہے جو ہم نے ذکر کی کہ بچہ تبعاً ماں کے ساتھ وصیت میں داخل ہو جاتا ہے جب کہ وہ ماں کے ساتھ متصل ہوتا ہے

تو انفصال کی صورت میں بھی وصیت سے خارج نہ ہوگا جیسا کہ بیع اور عتق میں ہوتا ہے۔ (یعنی حاملہ باندی فروخت کرنے میں بچہ بھی تبعاً بیع میں داخل ہوتا ہے یا باندی آزاد کی تو بچہ بھی آزاد ہو جاتا ہے) پس دونوں میں برابر وصیت جاری ہوگی بغیر اس کے کہ ماں کو مقدم کیا جائے۔

امام ابو حنیفہ رح کی دلیل یہ ہے کہ ماں کو وصیت میں اصل کی حیثیت حاصل ہے اور بچے کو تابع کی اور تابع اصل سے مزاحمت نہیں کیا کرتا اگر ہم دونوں میں وصیت نافذ کریں تو اصل کے بعض اجزاء میں وصیت ٹوٹ جائے گی (بوجہ بچہ کی شمولیت کے) حالانکہ یہ بات جائز نہیں بخلاف بیع کے کیونکہ بیع میں یہ لازم نہیں آتا کہ جب بیع کو تابع تابع میں نافذ کیا جائے تو اصل میں بیع ٹوٹ جائے۔ بلکہ اصل میں بھی مکمل اور صحیح صورت میں باقی رہتی ہے۔ (اور مبیع کا کوئی حصہ عقد سے خارج نہیں ہوتا) البتہ اتنی بات ہے کہ ثمن کا کچھ حصہ اصل کے بالمقابل باقی نہیں رہتا اس مجبوری کی وجہ سے کہ ثمن کا یہ جزو بچے کے بالمقابل ہو جاتا ہے جب کہ بچے پر قبضہ کر لیا جائے لیکن اس میں کوئی ہرج نہیں کیونکہ ثمن بیع میں تابع ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ثمن ذکر کیے بغیر بھی بیع کا انعقاد ہو جاتا ہے۔ اگرچہ بیع فاسد ہو۔

یہ ساری تفصیل اس صورت میں ہے کہ باندی جب بچے کو

تقسیم ترکہ سے پہلے جنم دے۔ اگر وہ تقسیم کے بعد بچہ جنے تو بلا اختلاف وہ بچہ موصی لہٗ کا ہوگا۔ کیونکہ وہ موصی لہٗ کی خاص ملک کی پیداوار ہے۔ اس لیے کہ تقسیم کے بعد اس کی ملکیت پوری طرح متقرر ہو چکی ہے۔

فَصْلٌ فِی اِعْتِبَارِ حَالَةِ الْوَصِیَّةِ

حالتِ وصیت کے معتبر ہونے کے احکام

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا کہ اگر مریض نے ایک عورت کے لیے قرض کا اقرار کیا یا اس کے لیے کچھ وصیت کی یا اسے ہبہ کیا۔ پھر اس نے نکاح کر لیا۔ بعد ازاں وہ مریض مر گیا تو اقرار جائز ہوگا۔ وصیت اور ہبہ باطل ہوگا کیونکہ اقرار تو خود حجتِ ملزمہ ہے (یعنی آدمی جس چیز کا اقرار کرے وہ چیز اس پر لازم ہو جاتی ہے) اور اقرار صادر ہونے کے وقت عورت اجنبیہ تھی اس لیے اقرار کا اعتبار پورے مال سے کیا جائے گا اور اقرار کسی اور قرض کی وجہ سے بھی باطل نہیں ہوتا خواہ وہ قرض بحالتِ صحت ہو یا بحالتِ مرض۔ البتہ اتنا فرق ضرور ہے کہ قرضۂ صحت کو قرضۂ مرض پر مقدم کیا جاتا ہے۔ بخلاف وصیت کے (کہ وہ بوقتِ صدور ایجاب نہیں بلکہ) وہ بوقتِ موت ایجاب ہے اور موت

کے وقت یہ عورت میت کی وارث ہے اور وارث کے لیے وصیت
نہیں ہوا کرتی۔ ہبہ اگر صورت اور ظاہر کے لحاظ سے فی الحال مکمل
معلوم ہوتا ہے لیکن حکماً وہ مابعد الموت کی طرف مضاف ہے
کیونکہ ہبہ کے حکم کی تکمیل و تقرر تو موت کے وقت ہی ہوتا ہے۔ کیا
آپ کو معلوم نہیں کہ اگر مریض پر دین مستغرق ہو یعنی ایسا قرض جو
اس کے تمام مال کو محیط ہو تو ہبہ باطل ہو جاتا ہے اور قرض نہ ہونے
کی صورت میں تہائی ترکہ سے اس کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا اگر مریض نے
اپنے بیٹے کے لیے کسی قرض کا اقرار کیا اور اس کا بیٹا نصرانی ہے
یا اسے کچھ ہبہ کیا اور کچھ وصیت کی۔ موصی کی مدت سے پہلے بیٹے
نے اسلام قبول کر لیا تو یہ تمام چیزیں باطل ہو جائیں گی۔ ہبہ اور وصیت
کے بطلان کی وجہ تو ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں کہ بیٹا اس کی موت کے
وقت وارث ہے اور ہبہ و وصیت یا تو موت کے وقت ایجاب
کی حیثیت حاصل کرتے ہیں یا موت کے بعد۔ اقرار اگرچہ بذاتہ ملزم
یعنی لازم کرنے والا ہے لیکن سبب وراثت یعنی بیٹا ہونا بوقت
اقرار موجود ہے تو یہی سبب اس تہمت کے لیے معتبر ہوگا کہ اس
نے ایک بیٹے کو دوسروں پر بلا وجہ ترجیح دی۔ بخلاف مسئلہ سابقہ
کے کہ اس صورت میں وارث ہونے کا سبب اس عورت کی زوجیت
ہے حالانکہ زوجیت بعد میں طاری ہوئی ہے اقرار کے وقت موجود

نہ تھی) حتّیٰ کہ اگر اقرار کے وقت زوجیت موجود ہو اور یہ عورت اس وقت نصرانیہ تھی۔ لیکن خاوند کی موت سے پہلے اسلام لے آئی۔ تو اقرار صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ سببِ اقرار کے وقت سبب موجود تھا۔ (کہ یہ عورت اجنبیہ نہ تھی بلکہ زوجہ تھی)۔

اسی طرح اگر مذکورہ بیٹا غلام یا مکاتب ہو اور اسے آزاد کر دیا جائے تو مذکورہ بالا دلیل کے مدِّنظر ہبہ و وصیت باطل ہوگی۔

مبسوط کے کتاب الاقرار میں مذکور ہے کہ اگر اس غلام بیٹے پر قرض نہ ہو تو باپ کا اقرار اس کے حق میں صحیح ہوگا۔ کیونکہ یہ اقرار اس کے آقا کے لیے ہوگا۔ اور آقا اجنبی شخص ہے۔ اگر اقرار کے وقت غلام پر قرض ہو تو اقرار صحیح نہ ہوگا کیونکہ یہ اقرار اسی غلام کے لیے ہے حالانکہ وہ اس کا بیٹا ہے اور وصیت اس غلام بیٹے کے حق میں اسی دلیل کی وجہ سے باطل ہوگی جو ہم نے ذکر کی ہے کہ وصیت کے سلسلے میں موت کے وقت کا اعتبار ہوتا ہے (اور اس وقت وہ وارث ہے)

ہبہ کے بارے میں بعض حضرات نے کہا کہ صحیح ہوگا کیونکہ ہبہ فی الحال مالک بنانے کا نام ہے۔ اور فی الحال وہ غلام ہے اور عام روایات میں مذکور ہے کہ مرض الموت کی حالت میں ہبہ کرنا وصیت کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے صحیح نہ ہوگا۔

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا کہ مقعد یعنی وہ شخص

جو کھڑا نہیں ہوسکتا۔ مفلوج۔ شل۔ اور جو شخص مرض دق میں مبتلا ہو ان امراض کے مریض نے اگر ہبہ کیا تو اس کی دو صورتیں ہیں کہ اگر زمانۂ مرض طویل ہوا وراس کے فی الحال مرنے کا خوف نہ ہو تو اس کا ہبہ پورے مال سے معتبر ہوگا۔ کیونکہ جب طویل عرصہ گزر چکا ہے تو یہ بیماری اس کی عادت ثانیہ بن چکی ہے اسی لیے وہ دوا دارو کی طرف توجہ نہیں دیتا (تو اس کے تصرفات ایک صحت مند آدمی کے تصرفات شمار ہوں گے)

اگر وہ ہبہ کے بعد صاحب فراش ہوجائے تو یہ نئے پیش آنے والے مرض کی طرح ہوگا (اوراس کا ہبہ تہائی مال سے معتبر ہوگا)

اگر ایک شخص نے اس وقت ہبہ کیا جبکہ اس کو مرض کا عارضہ پیش آیا تھا اور یہ انہی ایام میں مرگیا تھا تو اس ہبے کا اعتبار تہائی مال سے کیا جائے گا جب کہ وہ موت تک صاحب فراش رہے کیونکہ اس مرض کی وجہ سے موت کا خدشہ ہے۔ اور اسی بناء پر مرض کا علاج ومعالجہ بھی کیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ مرض الموت شمار ہوگا۔ (اور اس کے تصرفات تہائی مال تک معتبر ہوں گے۔

وَاللّٰہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ

بَابُ الْعِتْقِ فِی مَرَضِ الْمَوْتِ

مرض الموت میں غلام آزاد کرنے کا بیان

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا اگر ایک شخص نے اپنا غلام مرض الموت کے دوران آزاد کیا۔ یا کوئی مال فروخت کیا جس میں محابات سے کام لیا یعنی اصل قیمت سے کم پر فروخت کیا یا کسی کو کوئی چیز ہبہ کی۔ تو یہ سب کچھ جائز ہوگا اور ترکہ کی تہائی ہے اس کا اعتبار کیا جائے گا اور ان میں سے ہر ایک کو اصحاب وصایا کے ساتھ شریک کیا جائے گا۔

قدوری کے بعض نسخوں میں جائز کی بجائے فَھُوَ وَصِیَّۃٌ کے الفاظ ہیں۔ وصیت کے لفظ سے مراد یہ ہے کہ تہائی ترکہ سے اعتبار ہوگا اور مذکورہ اشخاص اصحاب وصیت کے ساتھ شریک ہوں گے یہ مراد نہیں کہ عتق بیع اور ہبہ وغیرہ حقیقۃً وصیت ہیں۔ کیونکہ وصیت بعد الموت ایجاب کا نام ہے اور یہ مذکورہ تصرفات فی الحال واقع

ہونے والے ہیں اور موت کی طرف مضاف ہیں۔ حق ورثاء سے متعلق ہونے کی وجہ سے ان تصرفات کو تہائی مال تک اعتبار کیا جاتا ہے۔

اسی طرح ہر وہ تصرف جس کے ذریعے مریض اپنے اوپر کچھ واجب کرے مثلاً ضمان وکفالت وغیرہ ایسے تصرفات بھی وصیت کے حکم میں ہوں گے (اور تہائی مال سے معتبر ہوں گے) کیونکہ مریض ہبہ کی طرح اس قسم کے تصرف میں بھی متّہم ہوتا ہے (تو اس قسم کا قرضہ ترکہ پر مقدم نہ ہوگا) اور ہر وہ چیز جو مریض موت کے بعد واجب کرے اس کا اعتبار تہائی سے کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس نے اپنی صحت اور تندرستی کی حالت میں واجب کیا ہو اس لیے کہ حالت عقد کا اعتبار نہیں کیا جاتا بلکہ اس نسبت و اضافت کا اعتبار کیا جاتا ہے جس پر عقد دائر ہے۔ اور جو تصرف اس نے فی الحال نافذ کر دیا ہے (جیسے اعتاق وہبہ) اور اسے موت کی طرف مضاف نہیں کیا تو اس میں حالت عقد کا اعتبار ہوگا (یعنی عقد کے وقت اس کی حالت دیکھی جاتی ہے کہ وہ تندرست تھا یا مریض) اگر وہ اس وقت تندرست ہو تو اس کا یہ تصرف کل مال سے معتبر ہوگا۔ اگر عقد کے وقت مریض ہو تو تہائی مال سے اعتبار ہوگا۔

ہر وہ مرض جس سے انسان کو صحت حاصل ہو جائے تو وہ حالت صحت کی طرح ہوگا۔ کیونکہ تندرست ہو جانے پر ظاہر ہو گیا کہ اس

سے مال کے ساتھ کسی کا حق متعلق نہ تھا۔

مسئلہ:۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ اگر مریض نے کسی کے ساتھ بیع محابات کی اس کے بعد ایک غلام آزاد کیا اور ثلث مال میں ان دونوں باتوں کی گنجائش نہیں تو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک محابات اولیٰ ہوگی۔

اگر مریض پہلے غلام آزاد کرے پھر بیع محابات کرے تو اس صورت میں عتق اور محابات برابر ہوں گے (یعنی حصۂ رسد میں دونوں یکساں ہوں گے) صاحبین رحمہما اللہ نے فرمایا کہ دونوں صورتوں میں عتق کو اولیت حاصل ہوگی۔

اس بارے میں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جب وصایا میں کوئی ایسی وصیت نہ ہو جو ثلث سے تجاوز کرنے والی ہے تو اصحاب وصیت میں سے ہر ایک اپنی پوری وصیت کے ساتھ اس موصی کی تہائی میں حصہ دار قرار دیا جائے گا اور کسی موصیٰ لہٗ کو دوسرے موصیٰ لہٗ پر ترجیح حاصل نہ ہوگی۔ سوائے تین صورتوں کے پہلی یہ کہ مرض کی حالت میں عتق واقع کیا ہو دوسری یہ کہ عتق موصی کی موت سے متعلق ہو۔ جیسے صحیح طور پر عقدِ تدبیر کرنا یعنی غلام کو مدبر بنانا۔ تیسری بحالتِ مرض بیع میں محابات کرنا (ان تین صورتوں میں مقدم کرنا جائز ہے جب کہ تہائی مال سے متجاوز نہ ہوں اور ہر صاحب وصیت اپنی مقدار کے حساب سے پورا حق دار ہوگا) کیونکہ وصیتیں تمام برابر ہیں (اور استحقاق کا سبب وصیت ہی ہوتی ہے) استحقاق کے سبب میں

برابر ہونے سے نفسِ استحقاق میں بھی مساوات لازم ہوتی ہے۔
عتق جس کا ابھی ہم نے ذکر کیا ہے یعنی عتق بحالتِ مرض اور عتق معلق بمرض اس عتق کو اس لیے مقدم کیا جاتا ہے کہ عتق دوسری وصیتوں کی بہ نسبت زیادہ قوی ہے۔ کیونکہ موصی کی طرف سے اس کے ساتھ فسخ لاحق نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس کے علاوہ دوسری وصیتوں کے ساتھ فسخ لاحق ہوسکتا ہے۔ اسی طرح محابات کی صورت میں بھی موصی کی طرف سے فسخ لاحق نہیں ہوسکتا (کیونکہ بیع کا عقد تکمیل پانے کے بعد فسخ نہیں ہوا کرتا) جب ترکہ کی تہائی میں عتق اور محابات کو مقدم کر دیا گیا تو تہائی مال سے باقی ماندہ مقدار میں ان دو کے سوا باقی اصحاب وصیت برابر ہوں گے اور بعض کو بعض پر کسی قسم کی فوقیت نہ ہوگی۔

اختلافی مسئلے (یعنی عتق و محابات کی دونوں صورتوں میں عتق کو اولیت حاصل ہوتی ہے) میں صاحبینؒ کی دلیل یہ ہے کہ عتق محابات کی نسبت قوی تر ہے۔ کیونکہ عتق پر فسخ طاری نہیں ہوتا اور محابات پر مشتری کی جانب سے فسخ لاحق ہوسکتا ہے اور بیان میں مقدم کرنے کا کوئی اعتبار نہیں۔ کیونکہ صرف ذکر کی تقدیم سے ثبوتِ حکم میں تقدیم واجب نہیں ہوتی۔

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ عتق کی بہ نسبت محابات قوی تر ہوتی ہے۔ کیونکہ محابات ایسی وصیت ہے جو عقدِ معارضہ کے ضمن

میں ثابت ہوتی ہے تو یہ معنوی لحاظ سے تبرّع ہے صیغہ اور لفظ کے لحاظ سے تبرع نہیں (بلکہ معارضہ ہے) لیکن اعتاق لفظی اور معنوی دونوں لحاظ سے تبرع ہے تو جس صورت میں محابات عتق سے پہلے واقع ہوئی محابات نے اپنے سے کمزور تصرف یعنی عتق کو دفع کر دیا۔ اور جب اعتاق پہلے واقع ہوا اور ثابت بھی ہو گیا۔ اور اس میں دفع کیے جانے کا احتمال بھی نہیں تو اس کے لوازمات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ دوسرے کی مزاحمت کرے۔ (اس لیے دونوں برابر ہوں گے جیسا کہ امامؒ نے دوسری صورت میں کہا ہے)۔

اسی اصول کی بناء پر امام ابو حنیفہؒ نے کہا کہ اگر اس نے پہلے محابات کی پھر اعتاق کیا اور پھر محابات کی تو تہائی مال دونوں محاباتوں میں نصف نصف تقسیم کیا جائے گا کیونکہ دونوں محابات مساوی درجہ کی ہیں۔ پھر دوسری محابات کے حصے میں جو نصف آیا ہے اسے اس محابات (ثانیہ) اور عتق کے درمیان تقسیم کیا جائے گا۔ کیونکہ عتق دوسری محابات پر مقدم تھا۔ لہذا دونوں برابر ہوں گے۔

اگر پہلے اعتاق کرے پھر محابات کرے اور پھر اعتاق کرے تو تہائی کو محابات اور عتق اوّل کے درمیان تقسیم کیا جائے گا اور جو نصف عتق اوّل کے حصے میں آئے گا۔ اسے عتق اول اور عتق دوم کے درمیان تقسیم کیا جائے گا۔ لیکن صاحبینؒ کے نزدیک عتق کو بہر حال اوّلیّت حاصل ہے۔

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا۔ اگر ایک شخص نے وصیت کی کہ میری طرف سے ان سو درہم کے عوض ایک غلام خرید کر

آزاد کر دیا جائے۔ اس سو دراہم سے ایک درہم تلف ہو گیا تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ان باقی ماندہ ننانوے دراہم کے عوض غلام آزاد نہیں کیا جائے گا۔

اگر اس نے اپنی طرف سے حج کرانے کی وصیّت کی (اور اس رقم سے کچھ حصہ تلف ہو گیا) تو باقی ماندہ رقم سے اس کی طرف سے حج کرایا جائے گا جس جگہ سے بھی کوئی شخص بیت اللہ تک پہنچ سکے۔ اگر اس مال سے کچھ بھی ضائع نہ ہوا اور حج کرانے کے بعد کچھ رقم بچ جائے تو باقی بچی ہوئی رقم ورثاء کو دی جائے گی۔

اعتاق کی صورت میں صاحبینؒ کا نظریہ ہے کہ باقی ماندہ رقم یعنی ننانوے دراہم کے عوض غلام خرید کر آزاد کیا جائے۔ کیونکہ اعتاق تقرب کی ایک قسم کی وصیّت ہے تو حج کی وصیّت پر قیاس کرتے ہوئے اس وصیت کا نفاذ ضروری ہوگا جہاں تک کہ ممکن ہو سکے۔

امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ موصی نے ایسے غلام کے عتق کی وصیت کی ہے جو ایک سو درہم کے عوض خریدا جائے۔ اور وصیت کو ایسے غلام کے بارے میں نافذ کرنا جو سو درہم سے کم پر خریدا جائے تو موصیٰ بہ کے علاوہ کسی دوسری چیز میں وصیت کا نافذ کرنا ہوگا اور ایسا کرنا جائز نہیں۔ بخلاف اس صورت کے جب کہ حج کے لیے وصیت کی جائے۔ کیونکہ یہ وصیت قربت محض ہے جو اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور مقررہ رقم [illegible] مستحق میں کوئی تبدیلی نہیں آتی (کیونکہ [illegible]

بھی حج کی ابتداء کی جائے وہ حج اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہوگا) حج کی وصیت والا یہ مسئلہ ایسا ہوگا جیسے کوئی شخص وصیت کرے کہ فلاں شخص کو سو درہم دے دیے جائیں اور ان میں سے کچھ درہم ضائع ہو جائیں تو باقی دراہم اسے دے دیے جائیں گے۔

بعض حضرات مثلاً فخر الاسلام بزدوی نے کہا کہ یہ مسئلہ ایک اور اصول پر مبنی ہے جو امامؒ اور صاحبینؒ کے درمیان مختلف ہے۔ صاحبینؒ کے نزدیک اصول یہ ہے کہ عتق اللہ تعالیٰ کا حق ہے حتیٰ کہ غلام کے دعویٰ کے بغیر بھی اس پر شہادت مقبول ہے۔ لہٰذا مال میں تبدیلی آنے سے مستحق میں کوئی تبدیلی نہیں آتی بلکہ حج کی طرح وہی ذات مستحق رہتی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عتق بندے کا حق ہے چنانچہ اس پر بغیر دعویٰ بینہ قبول نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا مال میں تغیر آجانے سے مستحق میں تبدیلی آجائے گی یہی بات زیادہ مناسب ہے۔

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا۔ ایک شخص نے دو بیٹے چھوڑے۔ سو درہم اور ایک غلام جس کی قیمت سو درہم ہے چھوڑا۔ لیکن غلام کو اس نے مرض الموت میں آزاد کر دیا تھا دونوں وارثوں نے اس کی اجازت دے دی تو غلام اپنی قیمت کی ادائیگی کے سلسلے میں کوئی سعایت نہیں کرے گا۔ کیونکہ مرض الموت میں آزاد کرنا اگرچہ وصیت کے حکم میں ہے حالانکہ یہ وصیت تہائی سے زائد مقدار

پر واقع ہو رہی ہے لیکن ورثاء کی اجازت سے جائز ہو جاتی ہے کیونکہ ممانعت تو ان کے حق کی بناء پر تھی اور انھوں نے اپنے حق کو اپنی مرضی سے ساقط کر دیا ہے لہٰذا مانع زائل ہو گیا۔

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا اگر ایک شخص نے اپنا غلام آزاد کرنے کی وصیت کی پھر وہ مر گیا اور غلام نے جنایت کا ارتکاب کیا اور جرم کے عوض اسے دے دیا گیا تو وصیت باطل ہو گئی۔ کیونکہ بحق جنایت اس غلام کا دیا جانا صحیح ہے۔ اس لیے کہ ولیِ جنایت کا حق موصی کے حق پر مقدم ہوتا ہے۔ اسی طرح موصٰی لہٗ کے حق پر بھی مقدم ہوگا۔ کیونکہ موصٰی لہٗ کو موصی کی جہت سے ملکیت حاصل ہوتی ہے۔ البتہ اتنی بات ہے کہ موصی کی ملکیت اس غلام میں باقی رہتی ہے اور غلام کے سپرد کر دینے پر یہ ملکیت زائل ہو جاتی ہے۔ جب ولیِ جنایت کو غلام سپرد کر دیا گیا اور موصی کی ملکیت زائل ہو گئی تو وصیت باطل ہو گئی۔ جیسا کہ موصی اسے فروخت کر دے یا اس کا وارث (بسبب دین کے) فروخت کر دے تو وصیت باطل ہو جاتی ہے۔

اگر ورثاء مجرم غلام کا فدیہ دیں تو فدیہ کی رقم ورثاء اپنے مال سے دیں گے۔ کیونکہ ورثاء نے ہی فدیہ کا التزام کیا ہے۔ اور وصیت جائز رہے گی کیونکہ فدیہ کی بناء پر غلام جنایت کے جرم سے پاک ہو گیا ہے گویا کہ اس نے جرم کا ارتکاب کیا ہی نہ تھا لہٰذا وصیت نافذ ہو گی۔

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا ایک شخص نے

دوسرے کے لیے ایک تہائی مال کی وصیت کی۔ پس موصٰی لہٗ اور وارث نے اقرار کیا کہ میت نے اس غلام کو آزاد کر دیا تھا۔ موصٰی لہٗ نے کہا کہ موصی نے اس غلام کو بحالتِ صحت آزاد کیا تھا (جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ عتق کل مال سے نافذ ہوگا اور باقی ماندہ کی تہائی میرے لیے ہے) وارث نے کہا کہ موصی نے اسے مرض الموت میں آزاد کیا تھا۔ (لہٰذا یہ عتق کل مال سے نہ ہوگا بلکہ تہائی سے ہوگا کیونکہ عتق تیری وصیت پر مقدم ہے) وارث کے قول کو تسلیم کیا جائے گا اور موصٰی لہٗ کو ثلث مال سے کچھ نہ ملے گا ہاں اگر عتق کے بعد کچھ مقدار بچ جائے تو وہ موصٰی لہٗ کو دی جائے گی۔ یا موصٰی لہٗ کی طرف سے شہادت قائم ہو جائے کہ عتق واقعی بحالتِ صحت تھا۔

وارث کا قول معتبر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ موصٰی لہٗ اس بات کا مدعی ہے کہ عتق کے بعد کل ترکہ سے جو مال بچ جائے وہ اس کے ثلث کا مستحق ہے کیونکہ صحت کی حالت میں عتق وصیت نہیں ہوتا۔ اسی لیے ایسا عتق پورے مال سے نافذ ہوتا ہے اور وارث اس سے منکر ہے۔ کیونکہ اس کا مدعا تو حالتِ مرض میں عتق کا ثابت کرنا ہے جو کہ بمنزلۂ وصیت ہے۔ کیونکہ صحت کی حالت میں عتق وصیت نہیں ہوتا اور عتق بحالتِ مرض وصیت بثلث المال پر مقدم ہوا کرتا ہے تو وارث منکر ہوگا۔ اور منکر کا قول قسم کے ساتھ قابلِ قبول ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ غلام کی آزادی امرِ حادث ہے اور نئے پیش آنے والے واقعات کو قریب تر اوقات کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کیونکہ یہ اوقات یقینی ہوتے ہیں۔ تو ظاہر حال وارث کا مؤید ہے۔ لہٰذا قسم کے ساتھ اس کی بات تسلیم کی جائے گی۔ البتہ اگر ثلث میں سے غلام کی قیمت نکالنے پر کچھ بچ جائے تو موصٰی لہٗ کو دی جائے گی۔ کیونکہ اس باقی ماندہ مقدار میں اس کے ساتھ کوئی دوسرا مزاحمت کرنے والا نہیں۔ یا موصٰی لہٗ کو بینہ دستیاب ہو جائے کہ عتق کا معاملہ دورانِ صحت طے پایا تھا۔ کیونکہ جو چیز بینہ سے ثابت ہو وہ مشاہدہ سے ثابت ہونے والی چیز کی طرح ہوتی ہے اور یہ موصٰی لہٗ اثباتِ حق کے لیے بینہ قائم کرنے کے سلسلے میں خصم ہے (یعنی اس کو خصومت کا حق ہے اس کی بینہ قابلِ قبول ہوگی)

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا ایک شخص نے ایک غلام ترکہ میں چھوڑا۔ غلام نے وارث سے کہا کہ تیرے باپ نے مجھے بحالتِ صحت آزاد کر دیا تھا اور ایک شخص نے کہا کہ میرے ایک ہزار درہم تیرے والد کے ذمہ واجب الاداء تھے۔ وارث نے دونوں کے قول کی تصدیق کی امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ غلام اپنی قیمت کے لیے سعایت کرے گا۔

صاحبینؒ نے فرمایا کہ غلام آزاد کر دیا جائے گا اور کسی چیز کے

لیے سعایت نہ کرے گا کیونکہ ایک ہی سلسلۂ کلام میں وارث کی تصدیق کی وجہ سے میت پر قرض اور حالتِ صحت میں عتق دونوں بیک وقت ظاہر ہوئی ہیں تو گویا یہ دونوں بیک وقت وقوع پذیر ہوئی تھیں۔ اور عتق بحالتِ صحت سعایت کو واجب نہیں کرتا اگرچہ معتق پر قرض بھی ہو (لہٰذا صاحبینؒ نے غلام پر سعایت واجب قرار نہ دی)

امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ اقرارِ قرض بہ نسبت عتق کے قوی تر ہوتا ہے کیونکہ اقرارِ قرض کا اعتبار پورے مال سے کیا جاتا ہے۔ اور اقرارِ عتق بحالتِ مرض کا اعتبار ثلثِ مال سے ہوتا ہے اور قوی تر کمزور تر کو دفع کر دیتا ہے۔ تو اس قانون کا تقاضا یہ ہے کہ عتق اصل ہی سے باطل ہو جائے لیکن عتق جب ایک بار واقع ہو جائے تو پھر باطل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا سعایت واجب کرتے ہوئے عتق کو بحیثیتِ معنی دفع کیا جائے گا (یعنی سعایت کا وجوب گویا عتق کے معنی کا بطلان ہے کیونکہ عتق کسی عوض کے بغیر ہوتا ہے)۔

سعایت واجب کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرض عتق سے سابق ہے کیونکہ سابقہ حالت کی طرف سے منسوب کرنے سے کوئی چیز مانع نہیں (لہٰذا اسے حالتِ صحت کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے) اور عتق کو اس حالت کی طرف منسوب کرنا ممکن نہیں کیونکہ قرض عتق کے بحالتِ مرض صفت واقع ہونے سے مانع ہے اس لیے غلام پر سعایت واجب ہو گی۔

اس اختلاف پر یہ صورت بھی محمول ہے جب کہ ایک شخص ہزار درہم کا ترکہ چھوڑ کر مرا اور ایک شخص نے کہا کہ میرا میت پر ایک ہزار درہم کا قرض تھا اور دوسرے نے کہا کہ میرے ایک ہزار درہم میت کے پاس بطور امانت تھے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ودیعت بہ نسبت قرض کے قوی تر ہے (کیونکہ قرض ایک واجب فی الذمہ چیز کا نام ہے۔ اور ودیعت ایک معین چیز ہے۔ حقوق ذمہ کے وجوب کے معاملات میں اعیان زیادہ قوی ہوتے ہیں)۔

صاحبینؒ کے نزدیک دونوں برابر ہیں (لہٰذا ترکہ کو قرض اور ودیعت کے سلسلے میں نصف نصف کیا جائے گا)۔

حقوق اللہ وغیرہ میں وصیت کا بیان

مسئلہ: امام قدوریؒ نے فرمایا اگر کسی شخص نے حقوق اللہ کے بارے میں متعدد وصیتیں کیں تو ان میں سے فرائض کو مقدم کیا جائے گا خواہ موصی نے ان کا ذکر مقدم کیا ہو یا مؤخر جیسے حج، زکاۃ اور کفارات وغیرہ۔ کیونکہ فرائض نوافل سے اہم ہوتے ہیں اور موصی کی طرف سے ظاہر یہی تھا کہ وہ فرائض کی ادائیگی سے ابتداء کرنا اس لیے کہ فرائض کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

اگر تمام وصیتیں قوت و اہمیت میں مساوی درجہ کی ہوں تو جس وصیت کا موصی نے مقدم ذکر کیا ہے اسی سے شروع کیا جائے گا جب کہ تہائی مال ان تمام وصیتوں کے ایفاء کی گنجائش نہ رکھتا ہو کیونکہ ظاہر یہی ہے کہ موصی وصیت کرنے میں اسی چیز سے ابتداء کرتا ہے جو اس کے نزدیک اہم ہے۔

امام طحاویؒ نے فرمایا کہ زکاۃ سے ابتداء کی جائے اور اسے حج پر مقدم کیا جائے۔ دو روایتوں میں سے ایک روایت امام ابو یوسفؒ سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ امام ابو یوسفؒ سے دوسری روایت یہ ہے کہ حج کو مقدم کیا جائے گا۔ امام محمدؒ کا بھی یہی قول ہے۔

پہلی روایت کی وجہ یہ ہے کہ زکاۃ و حج اگرچہ فرضیت کے لحاظ سے مساوی حیثیت رکھتے ہیں لیکن زکواۃ کے ساتھ حقوق العباد کا تعلق ہے لہٰذا زکواۃ کو اولیت حاصل ہوگی۔

دوسری روایت کی وجہ یہ ہے کہ مال اور نفس دونوں سے حج کا قیام ہوتا ہے اور زکواۃ صرف مال تک محدود ہوتی ہے۔ تو حج زکواۃ کی نسبت قوی تر ہے۔

زکواۃ اور حج کو کفارات پر اولیت حاصل ہوگی۔ کیونکہ حج و زکواۃ کو کفارات پر بوجہ قوت فوقیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ حج و زکواۃ کے سلسلے میں شرع کی طرف سے ایسی وعید وارد ہے جو کفارات کے بارے میں وارد نہیں۔

قتل، ظہار اور قسم کے کفارے صدقۂ فطر پر مقدم ہوں گے کیونکہ ان کفارات کا وجوب قرآن کریم سے ثابت ہے اور صدقۂ فطر کا وجوب قرآن حکیم سے ثابت نہیں۔

صدقۂ فطر قربانی کی وصیت پر فوقیت رکھتا ہے کیونکہ صدقۂ فطر کے وجوب پر فقہاءِ کرام کا اتفاق ہے اور قربانی کے وجوب میں

اختلاف ہے۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے واجبات میں سے بعض کو بعض پر مقدم کیا جائے گا۔

مسئلہ:۔ فرمایا اگر ایسے امور کی وصیت کی جو واجب نہیں ہیں (اور تہائی میں سب کی گنجائش نہیں) تو ان میں سے وہ امور مقدم کیے جائیں گے جن کو موصی نے مقدم کیا ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ اور یہ ایسے ہوگا جیسے کہ خود موصی نے ان کو مقدم کرنے کی صراحت کر دی ہو۔

مشائخ نے فرمایا کہ ثلث مال کو تمام وصیتوں پر تقسیم کر دیا جائے خواہ وہ حقوق اللہ سے متعلق ہوں یا حقوق العباد سے پھر جو مقدار قربات و عبادات کے حصہ میں واقع ہو اسی کو ہماری بیان کردہ ترتیب کے مطابق خرچ کیا جائے۔ قربات کی تعداد پر تقسیم کیا جائے اور تمام قربات کو ایک وصیت کے درجہ میں نہیں کیا جائے گا۔ اس لیے اگر ان سب سے رضاءِ الٰہی مطلوب ہے تو ان میں سے ہر قربت مقصود بالذات ہے۔ اور ہر ایک مستقل طور پر رضاءِ الٰہی کا ذریعہ ہے لہٰذا وہ مستقل اور الگ ہی رہے گی جیسے کہ چند اشخاص کی وصیتیں الگ الگ شمار کی جاتی ہیں۔

مسئلہ:۔ امام قدوری نے فرمایا۔ اگر ایک شخص نے حج اسلام کی وصیت کی تو ورثاء پر واجب ہے کہ ایک شخص سے موصی کے شہر سے حج کرائیں جو سوار ہو کر سفرِ حج کرے گا۔ کیونکہ موصی پر اللہ تعالیٰ

کی رضا کے لیے اس کے اپنے شہر سے حج واجب تھا۔ اسی بناء پر حج کی وصیت نافذ کرنے میں اس قدر تہائی مال کا ہونا ضروری ہے جو اس کے شہر سے حج کرنے کے لیے کافی ہو اور وصیت تو اسی حج کی ادائیگی کے لیے ہے جو اس پر واجب ہے۔ "راکباً" کی قید امام قدوریؒ نے اس لیے لگائی کہ اصل موصی پر پیدل چلنے کی صورت سے حج لازم نہیں ہوتا (کیونکہ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا کی شرط قرآن کریم میں موجود ہے۔ استطاعت سے مراد سواری پر قدرت ہے) لہٰذا موصی کے نائب کی طرف بھی یہ فریضہ اسی صورت کے ساتھ متوجہ ہوگا جس صورت سے اصل موصی پر واجب ہوا تھا۔

مسئلہ :۔ امام قدوریؒ نے فرمایا اگر وصیت کے ایفاء کے لیے تہائی مال سے اخراجات پورے نہ ہو سکیں تو ورثاء اس مقام سے موصی کی طرف سے حج کرا دیں جہاں سے وہ اخراجات حج کے لیے پورے ہو سکتے ہیں۔ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ اخراجات کی عدم کفایت کی صورت میں اس کی طرف سے حج نہ کرایا جائے۔ کیونکہ موصی نے حج کی وصیت ایسی صفت کے ساتھ کی ہے جو اس مال میں مفقود ہے۔ (کیونکہ تہائی مال کی مقدار میں اتنی گنجائش نہیں کہ موصی کے شہر سے حج کرایا جا سکے) لیکن اس کے باوجود ہم نے اسے جائز قرار دیا اس لیے کہ ہم جانتے ہیں موصی کا مقصد یہ تھا کہ اس کی وصیت کا نفاذ ہو جائے۔ لہٰذا جہاں تک ممکن ہے اس کی وصیت کے نفاذ کی کوشش کی

جائے گی۔ اور اس میں اسی صورت کا امکان ہے جو ہم نے ذکر کی (کہ جس مقام سے مکہ مکرمہ تک پہنچا جا سکتا ہے وہیں سے حج کرا دیا جائے) اور یہ صورت وصیت کے اصلاً باطل کر دینے سے بدرجہا بہتر ہے۔ اور ہم اس مسئلہ میں اور وصیت بالعتق کے مسئلہ میں فرق بیان کر چکے ہیں (کہ اگر وصیت کردہ مال عتق کے لیے کافی نہ ہو تو عتق نافذ نہ ہوگا)

مسئلہ: امام قدوریؒ نے فرمایا۔ ایک شخص حج کے ارادے سے گھر سے روانہ ہوا اور راستے میں وفات پا گیا۔ اور یہ وصیت کر گیا کہ اس کی طرف سے حج کرا دیا جائے۔ تو موصی کی طرف سے اس کے شہر سے حج کرا دیا جائے گا۔ یہ امام ابو حنیفہؒ کی رائے ہے۔ اور امام زفرؒ کا قول بھی یہی ہے۔

امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ موصی کی طرف سے اس مقام سے حج کرایا جائے گا جہاں تک موصی پہنچ چکا تھا۔ یہ حکم استحسان کے پیش نظر ہے۔

اور اس صورت میں بھی اسی طرح کا اختلاف ہے کہ جب دوسرے شخص کی طرف سے حج کرنے والا راستے میں مر جائے (امامؒ کے نزدیک موصی کے شہر سے حج کرایا جائے گا اور صاحبینؒ کے نزدیک اس مقام سے جہاں تک پہلا شخص پہنچ چکا تھا)

صاحبینؒ کی دلیل یہ ہے کہ جتنا سفر حج کی نیت سے طے کیا جا

چکا ہے یہ بطورِ قربت وطاعت واقع ہوا ہے اور اس کی طے کردہ مسافت کے مطابق قطع مسافت کا فرض ادا ہو چکا ہے۔ اور اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں ثابت ہو چکا ہے۔ لہٰذا سفر کی ابتداء اس مقام سے کی جائے گی جہاں موصی کی موت واقع ہوئی۔ گویا کہ موصی اسی مقام کا باشندہ تھا۔

بخلاف سفرِ تجارت کے (یعنی اگر کوئی تاجر سفرِ تجارت کے دوران حج کی وصیت کرے اور دورانِ سفر مر جائے تو اس کے مرنے کے مقام سے حج نہیں کرایا جائے گا بلکہ اس کے شہر سے سفرِ حج کی ابتداء کی جائے گی) کیونکہ سفرِ تجارت بطورِ قربت واقع نہیں ہوتا لہٰذا اس کی طرف سے اس کے شہر ہی سے حج کرایا جائے گا۔

امام ابوحنیفہؒ دلیل دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وصیت با مذکورہ بیانِ مذکورہ بالا کے مطابق موصی کے شہر سے حج کرانے کی طرف راجع ہوگی۔ تاکہ حج اسلام جس طریق پہ فرض ہوا تھا اسی طریق پر ادا کیا جائے (اگر موصی خود حج کے لیے روانہ ہوتا تو وہ یقیناً اپنے گھر اور اپنے شہر سے سفر کی ابتداء کرتا۔ اسی طرح اس کا نائب بھی وہیں سے روانہ ہوگا)

وَاللّٰہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ

بَابُ الْوَصِيَّةِ لِلْأَقَارِبِ وَغَيْرِهِمْ

اقارب اور غیر اقارب کے لیے وصیت کا بیان

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا۔ اگر کسی شخص نے اپنے پڑوسیوں کے لیے وصیت کی تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک پڑوسی وہ لوگ ہیں جن کے گھر موصی کے گھر سے ملے ہوئے ہیں (یعنی ان کے گھروں کی دیواریں باہم ملی ہوئی ہوں خواہ ان کے دروازے اس کے گھر کے نزدیک ہوں یا دور)

صاحبینؒ کا ارشاد ہے کہ جو لوگ موصی کے محلہ میں اقامت پذیر ہیں اور مسجد محلہ ان کو جمع کرتی ہے سب پڑوسی ہیں خواہ ان کے گھر ملحق ہوں یا نہ ہوں۔ یہ بنظر استحسان ہے اور امام ابوحنیفہؒ کا قول قیاس کے مطابق ہے کیونکہ جار لفظ مجاورت سے ماخوذ ہے جس کا مطلب حقیقتًا اتصال اور لحوق ہے۔ اسی پڑوس اور اتصال کی بناء پر پڑوسی کو شفعہ کا استحقاق ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب لفظ کو ایسے تمام افراد کی طرف راجع کرنا ممکن نہ ہو تو ہم نے اخص الخصوص کی طرف راجع کیا اور یہ وہی پڑوسی ہے جس کے گھر کے دیواریں متصل ہوں۔

استحسان کی وجہ یہ ہے کہ عرف میں سارے اہل محلہ پڑوسی کہلاتے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ لَا صَلٰوۃَ لِجَارِ الْمَسْجِدِ اِلَّا فِی الْمَسْجِدِ یعنی مسجد کے پڑوسی کی نماز مسجد کے سوا درست نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ اس جار سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو اس مسجد کی اذان سنتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس وصیت کے ساتھ موصی کا مقصد یہ ہے کہ وہ پڑوسیوں کے ساتھ بھلائی کرے اور بھلائی کا برتاؤ ملاصق اور غیر ملاصق سب کے لیے عام ہے۔ البتہ اتنی بات کا خیال رکھا جائے گا کہ ان لوگوں کا باہمی میل جول ہو اور مسجد کے متحد ہونے کی صورت میں یہ میل جول ثابت ہوگا۔

اور جو بات امام شافعیؒ نے فرمائی کہ پڑوسی ہونا چالیس گھروں تک معتبر ہے تو یہ بات قیاس سے بعید ہے (کیونکہ اتنے دور تک باہمی میل جول نہیں پایا جاتا) اور اس بارے میں جو روایت منقول ہے وہ ضعیف ہے۔

مشائخ نے فرمایا جار کے لفظ میں مالک مکان۔ رہائش پذیر

مرد۔ عورت مسلم اور ذمی سب برابر ہیں۔ کیونکہ لفظ جار ان سب پر مشتمل ہے۔ امامؒ کے نزدیک اس میں وہ غلام بھی شامل ہے جو موصی کے مکان سے متصل اقامت پذیر ہو کیونکہ جار کا لفظ مطلق ہے۔ لیکن صاحبینؒ کے نزدیک لفظ جار میں غلام داخل نہ ہوگا کیونکہ اس کے لیے وصیت دراصل آقا کے لیے وصیت ہے اور وہ وہاں رہائش پذیر نہیں۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا۔ اگر کسی شخص نے اپنا اَصہار یعنی سسرال کے لیے وصیت کی تو یہ وصیت ہر ایسے شخص کے لیے ہوگی جو اس کی بیوی کا ذی رحم محرم ہو کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ جب آپ نے صفیہؓ سے نکاح کیا تو حضرت صفیہؓ کے اکرام کی خاطر ان کے مملوک ذی رحم محرموں کو آزاد فرما دیا اور یہ لوگ آپؐ کے اَصہار کہلاتے تھے۔ اسی تفسیر کو امام محمدؒ اور ابو عبیدہ لُغوی نے اختیار کیا ہے۔

اسی طرح اصہار کے تحت موصی کے باپ کی بیوی۔ اس کے بیٹے کی بیوی اور اس کے ہر ذی رحم محرم کی بیوی کے ذو رحم محرم بھی داخل ہیں کیونکہ یہ سب اصہار کہلاتے ہیں۔

اگر موصی مر گیا درآنحالیکہ یہ عورت اس کے نکاح میں ہے یا طلاق رجعی کی عدت گزار رہی ہے تو صہر اس وصیت کا مستحق ہوگا۔ اگر وہ عورت طلاق بائن کی عدت گزار رہی ہو تو صہر وصیت کے مستحق نہ

ہوں گے۔ کیونکہ صہریت کا بقاء نکاح کے بقاء پر ہوتا ہے اور نکاح کا باقی ہونا موصی کی موت کے وقت شرط ہے۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا اگر کسی نے اپنے اختان کے لیے وصیت کی تو موصی کی ذی رحم محرم عورتوں کے شوہر بھی شامل ہوں گے۔ (اختان ختن کی جمع ہے جس شخص کا دامادگی کا رشتہ ہو اسے ختن کہا جاتا ہے مثلاً موصی کی بیٹی، بہن اور پھوپھی وغیرہ کے خاوند شامل ہوں گے) اسی طرح ازواج کی ذی رحم محرم بھی داخل ہیں۔ کیونکہ ان سب کو ختن کہا جاتا ہے۔

بعض حضرات نے کہا کہ یہ اہل کوفہ کے عرف کے مطابق ہے۔ مگر ہمارے عرف کے مطابق محارم عورتوں کے شوہروں کے سوا دوسرے شامل نہ ہوں گے۔ اس میں آزاد، غلام، نزدیک و دور والے سب شامل ہیں کیونکہ یہ لفظ ان سب پر مشتمل ہے۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا۔ اگر کسی شخص نے اپنے اقارب کے لیے وصیت کی تو وصیت اقرب پھر اقرب کے لیے ہوگی جو اس کے ذی رحم محرم سے ہو۔ ان میں ماں باپ اور اولاد داخل نہ ہوگی۔

اور یہ وصیت دو افراد یا ان سے زائد کے لیے ہوگی۔ یہ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے۔ آپ کے ساتھیوں یعنی امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ نے فرمایا کہ یہ وصیت اس کے ان تمام اقارب کو شامل ہوگی جو اسلام میں ان کے جدِ اعلیٰ کی طرف منسوب ہوں۔ اور جدِ اعلیٰ اس کے آباء میں

وہ پہلا باپ ہے جو مشرف باسلام ہوا۔ یا جد اعلیٰ وہ ہے جس نے اسلام کا زمانہ پایا خواہ وہ اسلام نہ لایا ہو۔ بناء پر اس اختلاف کے جو مشائخ نے اس لفظ کے بارے میں کیا ہے۔

اس اختلاف کا ثمرہ ابوطالب کی اولاد میں ظاہر ہوگا کیونکہ ابوطالب نے اسلام کا زمانہ تو پایا تھا مگر اسلام نہ لائے۔

صاحبینؒ کی دلیل یہ ہے کہ قریب قرابت سے مشتق ہے۔ لہٰذا قریب کا اسم ہر اس شخص کو شامل ہوگا جس کے ساتھ قرابت قائم ہو پس اپنی حقیقت کے لحاظ سے اسم مذکور ان مواضع کو بھی شامل ہے جن میں اختلاف ہے (یعنی قرابت محرمہ ہو یا غیر محرمہ۔ نزدیک ہو یا دور سب کو شامل ہے)۔

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ وصیت میراث کی بہن ہے اور میراث میں اقرب پھر اقرب کا اعتبار کیا جاتا ہے (تو وصیت میں بھی اقارب میں سے سب سے قریب کا اعتبار ہوگا پھر جو اس کے بعد سب سے قریب ہو) اور میراث میں جمع سے مراد کم از کم دو فرد ہوتے ہیں اسی طرح وصیت میں بھی دو فرد ہوں گے۔

اس وصیت سے موصی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ واجب صلۂ رحمی کے سلسلے میں جو قصور ہوا ہے اس کی تلافی کردی جائے اور یہ صلہ رحمی انھیں اقارب کے ساتھ مخصوص ہے جن کو موصی کے ساتھ قرابت محرمہ ہو۔

اقارب کے لفظ میں وہ قرابت داخل نہ ہوگی جو ولادت کی بناد پہ ہے۔ کیونکہ ان کو اقرباء نہیں کہا جاتا اور جو شخص والد کو قریب کے نام سے موسوم کرے تو یہ تسمیہ اس کی طرف سے عقوق اور والد کی نافرمانی شمار ہوگی (مثلاً یوں کہے کہ میرا باپ میرا قریبی رشتہ دار ہے) کیونکہ عرفِ لسانی میں قریب اس شخص کو کہا جاتا ہے جو دوسرے کی جانب کسی غیر کے واسطہ سے تقرب حاصل کرے۔ حالانکہ باپ بیٹے کا تقرب بذاتِ خود ہے کسی غیر کے وسیلے سے نہیں۔ اور ظاہر لفظ کا کوئی اعتبار نہ ہوگا عیب کہ ظاہر کے ترک کرنے پر اجماع کا انعقاد ہو چکا ہے۔

لہٰذا امامؒ کے نزدیک لفظ اقارب بیان کردہ قیدکے ساتھ مشروط ہوگا۔ صاحبینؒ کے نزدیک اس قید کے ساتھ مقید ہوگا کہ وہ اسلام میں جدِ اعلیٰ کی طرف منسوب ہو۔ اور امام شافعیؒ کے نزدیک قرابت اس قید سے مشروط ہے کہ سب سے قریبی باپ کی طرف منسوب ہو۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا۔ اگر کسی شخص نے اقارب کے لیے وصیت کی۔ اور اس کے دو چچا اور دو ماموں ہیں تو امامؒ کے نزدیک یہ وصیت دونوں چچاؤں کے لیے ہوگی۔ کیونکہ امامؒ اقرب کا اعتبار کرتے ہیں جیسا کہ میراث میں ہوتا ہے۔ (کہ میراث میں ماموں سے چچا مقدم ہوتا ہے) صاحبینؒ کے نزدیک ان چاروں کے درمیان وصیت چار حصوں میں منقسم ہوگی۔ کیونکہ صاحبینؒ اقرب کا اعتبار نہیں کرتے (بلکہ صرف قرابت کا لحاظ رکھتے ہیں)

مسئلہ:۔ اگر کسی شخص نے ایک چچا اور دو ماموں چھوڑے تو اس صورت میں نصف وصیت چچا کے لیے ہوگی اور باقی نصف کو دو ماموں تقسیم کریں گے کیونکہ جمع کا اعتبار کرنا ضروری ہے (یعنی موصی کے استعمال کردہ لفظ اقارب میں) اور جمع کے وصیت کے معاملہ میں کم از کم دو فرد ہیں جیسا کہ میراث میں دو ہوتے ہیں۔ بخلاف اس کے اگر موصی ذی قرابت کا لفظ استعمال کرتا تو تمام وصیت چچا کے لیے ہوتی کیونکہ استعمال کردہ لفظ مفرد ہے لہٰذا ایک شخص ہی پوری وصیت کو حاصل کرتا ہے کیونکہ سب سے قریب تر یہی ہے۔

اگر جمع کے لفظ کی صورت میں صرف ایک چچا ہو تو اسے تہائی کا نصف ملے گا بدلیل مذکورہ بالا۔

اگر موصی نے ایک چچا۔ ایک پھوپھی۔ ایک ماموں اور ایک خالہ چھوڑی تو وصیت چچا اور پھوپھی کے درمیان برابر نصف نصف ہوگی کیونکہ دونوں قرابت میں برابر حیثیت رکھتے ہیں اور یہ قرابت ماموں اور خالہ کی بہ نسبت قوی تر ہے۔ پھوپھی اگرچہ وارث نہیں ہوتی لیکن وہ وصیت کی مستحق ہوتی ہے۔ جیسے کہ کسی شخص کا قریبی محرم کسی کا غلام ہو یا کافر ہو (غلامی اور کفر کی بناء پر وراثت سے محروم ہوتا ہے مگر وصیت کا استحقاق رکھتا ہے)۔

اسی طرح اگر کسی شخص نے ذوی قرابت۔ اقرباء یا انساب کا لفظ استعمال کرتے ہوئے وصیت کی۔ تو ان تمام صورتوں میں وصیت کا وہی حکم ہوگا۔

کیونکہ ان میں سے ہر ایک جمع کا لفظ ہے (اور قرابت پر بھی دلالت کرتا ہے)

اگر کوئی محرم نہ ہو تو وصیت باطل ہوگی۔ کیونکہ وصیت قرابت محرم کے ساتھ مقید ہے۔

صاحب ہدایہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ اگر کسی شخص نے اہل فلاں کے لیے وصیت کی۔ تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ لفظ صرف اس کی زوجہ پر صادق ہوگا اور صاحبینؒ نے کہا کہ لفظ اہل عرف میں ان تمام افراد کو شامل ہے جن کی وہ کفالت کرتا ہے اور ان کے نفقات کی ذمہ داری اٹھاتا ہے۔ نص قرآنی سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ وَأْتُونِي بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ۔ کہ تم میرے پاس اپنے سب گھر والوں کو لے کر آؤ۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اہل کا لفظ حقیقت لغت کے اعتبار سے زوجہ کے لیے بولا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَسَارَ بِأَهْلِهِ یعنی موسیٰ علیہ السلام اپنی بیوی کو لے کر چل پڑے اس کا شاہد ہے اور اسی معنی کے پیش نظر اہل عرب کہتے ہیں کہ تَأَهَّلَ بِبَلْدَةِ كَذَا کہ فلاں نے فلاں شہر میں تاہل کیا یعنی فلاں شہر میں نکاح کر لیا اور مطلق لفظ اپنے حقیقی معنوں کی طرف راجح ہوتا ہے۔

اگر فلاں کی آل کے لیے وصیت کرے تو یہ وصیت اس کے گھر والوں کے لیے ہوگی کیونکہ آل اس قبیلہ کو کہتے ہیں جس کی طرف انسان منسوب ہو۔

اگر اہل بیت کے لیے وصیت کی۔ تو اس میں اس کا باپ اور دادا بھی داخل ہوگا۔ کیونکہ باپ تو گھرانے کا اصل اور اس کی بنیاد ہوتا ہے۔

اگر اپنے اہل نسب یا اپنی جنس کے واسطے وصیت کی۔ نسب سے مراد یہ ہے کہ جس شخص کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور نسب آباء کی طرف سے ہوتا ہے اور اس کی جنس سے مراد اس کے باپ کے گھر والے ہیں۔ ماں کے گھرانے والے مراد نہیں۔ کیونکہ انسان اپنے باپ کے ساتھ ہم جنس ہوتا ہے۔ بخلاف قرابت کے کہ وہ ماں اور باپ دونوں کی طرف سے ہوتی ہے۔

اگر کسی شخص نے بنو فلاں کے یتامیٰ کے لیے وصیت کی یا بنو فلاں کے اندھوں یا اپاہجوں یا بیواؤں کے لیے اگر یہ لوگ فلاں کے جد اعلیٰ کے شمار میں آتے ہوں تو وصیت میں ان کے فقراء و اغنیاء خواہ مرد ہوں یا عورتیں سب داخل ہوں گے۔ کیونکہ ان کے حق میں تملیک ممکن ہے۔ اور وصیت تملیک یعنی مالک بنانے کو ہی کہا جاتا ہے۔ اگر اس قوم کے افراد اس قدر کثیر ہوں کہ شمار میں نہ آسکیں تو وصیت صرف ان کے فقراء کے لیے ہوگی۔ کیونکہ وصیت کا اصلی مقصد قربت و حصول اجر ہے۔ اور یہ قربت کسی کی حاجت روائی اور فاقہ کو دور کرکے ہی حاصل کی جا سکتی ہے اور یہ مذکورہ نام (یعنی اندھا، اپاہج وغیرہ) احتیاج کے متحقق ہونے سے آگاہ کرتے ہیں۔ تو فقراء پر محمول کرنا جائز ہے۔ بخلاف اس صورت کے جب بنو فلاں کے نوجوانوں کے لیے وصیت

کرے۔ حالانکہ یہ لوگ شمار سے باہر ہیں۔ یا کسی خاندان کے غیر شادی شدہ افراد کے لیے وصیت کی جو احاطۂ شمار میں نہیں آتے تو وصیت باطل ہوگی۔ کیونکہ ان الفاظ میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو فقر و احتیاج پر دال ہو تو اس کا فقراء پر صرف کرنا صحیح نہ ہوگا۔ اور اس وصیت کو سب کے حق میں بطور تملیک صحیح کرنا ممکن نہیں۔ کیونکہ حقداروں کی تعداد حد سے زائد مجہول ہوتی ہے۔ اور ان سب پر خرچ کرنا متعذر ہے (کیونکہ مجہول کی تملیک نہیں ہو سکتی)

فقراء و مساکین کے لیے وصیت کی صورت میں ہر قسم کے دو آدمیوں پر صرف کرنا واجب ہوتا ہے۔ جمع کے معنی کا لحاظ کرتے ہوئے وصیت میں جمع کے کم از کم دو افراد ہوتے ہیں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

اگر بنو فلاں کے لیے وصیت کرے تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عورتیں بھی داخل ہوں گی (یعنی جدِ اعلیٰ کے خاندان کی) یہ امامؒ کا پہلا قول ہے۔ صاحبینؒ نے بھی یہی قول اختیار کیا کیونکہ جمع مذکر کے صیغے میں عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ پھر امام اعظمؒ صاحب نے اپنے قول سے رجوع کیا اور فرمایا کہ یہ لفظ صرف فلاں کے مردوں کو شامل ہوگا۔ کیونکہ لفظ اپنی حقیقت کے لحاظ سے مردوں ہی کے لیے ہے اور عورتوں پر اس کا اطلاق حقیقی نہیں بلکہ مجازی ہے اور کلام حقیقی معنوں کے لیے ہوا کرتی ہے۔ بخلاف اس صورت کے کہ جب

بنو فلاں مثلاً بنو بکر کسی قبیلہ یا خاندان کا نام ہو تو اس صورت میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہوں گی کیونکہ اس صورت میں اعیان یعنی مذکر مراد نہیں ہوتے۔ کیونکہ یہ لفظ تو صرف انتساب کے لیے ہے جیسے بنی آدم۔ اسی بناء پر ایسے الفاظ سے کی گئی وصیت میں مولی العتاقہ مولی الموالات اور ان کے حلیف بھی داخل ہوں گے (مثلاً بنو بکر کہنے میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ان کے آزاد کردہ ہوں)

مسئلہ: امام قدوریؒ نے فرمایا۔ اگر ایک شخص نے کسی کی اولاد کے لیے وصیت کی تو یہ وصیت تمام اولاد کے درمیان برابر تقسیم ہوگی۔ اس میں مذکر و مؤنث برابر ہوں گے کیونکہ اولاد کا لفظ ان سب پر یکساں طور پر مشتمل ہے۔ (یعنی بطور حقیقت ان سب کو شامل ہے)۔

مسئلہ: اگر کسی نے فلاں شخص کے ورثاء کے لیے وصیت کی تو وصیت ان ورثاء کے درمیان تقسیم ہوگی بایں طور کہ مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملے گا۔ کیونکہ جب موصی نے ورثاء کے لفظ کی تصریح کردی تو اس نے اپنا ارادہ ظاہر کر دیا کہ اس کا مقصد اسی طرح کی تفصیل ہے جیسے کہ میراث میں ہوتی ہے (کہ ایک مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ دیا جاتا ہے)۔

ایک شخص نے اپنے موالی کے لیے وصیت کی۔ موصی کے کچھ موالی تو ایسے ہیں جن کو اس نے آزاد کیا تھا۔ اور کچھ موالی وہ ہیں جنھوں نے موصی کو آزاد کیا تھا تو وصیت باطل ہوگی۔ امام شافعیؒ نے اپنی بعض

کتابوں میں فرمایا کہ وصیت ان سب کے لیے ہوگی۔ ایک اور موقع پر امام شافعیؒ نے فرمایا کہ وصیت کے نفاذ میں ان کے باہمی صلح کرنے تک توقف کیا جائے گا (یعنی وہ آپس میں مل کر فیصلہ کرلیں کہ کونسا ایک فریق وصیت کا مستحق ہے یا دونوں برابر کے حق دار ہیں)۔ امام شافعیؒ کی دلیل یہ ہے کہ لفظ مولیٰ مشترک ہے جو دونوں قسم کے موالی کو شامل ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک کو مولیٰ کا نام دیا جاتا ہے۔ جیسے بھائیوں کا لفظ (کہ وہ تمام قسم کے بھائیوں کو شامل ہوتا ہے خواہ وہ عینی ہوں یا علاتی یا اخیافی)

ہماری دلیل یہ ہے کہ دونوں قسم کے موالی کی جہت مختلف ہے کیونکہ آزاد کرنے والے کو مولاءِ نعمت کہا جاتا ہے اور آزاد کردہ شدہ کو منعم علیہ کہتے ہیں تو یہ لفظ مشترک ہے۔ لہٰذا اثباتِ حق کی صورت میں ایک ہی لفظ دونوں کو شامل نہ ہوگا (اور اخوت کا لفظ عمومِ معنی کی وجہ سے بھائیوں کی اقسام کو شامل ہوتا ہے)

بخلاف اس کے اگر کسی شخص نے قسم کھائی کہ فلاں کے موالی سے کلام نہیں کرے گا تو اس میں مولاءِ اعلیٰ اور مولاءِ اسفل دونوں شامل ہوں گے۔ کیونکہ یہ مقامِ نفی ہے (یعنی اس حلف سے کسی چیز کا اثبات نہیں کیا جا رہا بلکہ بات کرنے کی نفی کی جا رہی ہے) اور نفی کی صورت میں دونوں کو شامل کرنے میں کوئی منافات نہیں۔

اس وصیت میں وہ تمام موالی شامل ہوں گے جن کو موصی نے بحالتِ

صحت آزاد کیا ہے یا بحالتِ مرض۔ البتہ اس کی امہات اولاد اور اس کے مدبر غلام اس وصیت میں داخل نہ ہوں گے۔ کیونکہ ان کی آزادی موت کے بعد ثابت ہوتی ہے اور وصیت کی نسبت حالتِ موت کی طرف ہوتی ہے (یعنی مرنے سے کچھ پہلے) لہٰذا یہ ضروری ہوگا کہ مولیٰ کا نام موت سے پہلے متحقق و ثابت ہو۔

امام ابو یوسفؒ کا ارشاد ہے کہ مدبر اور امہات الاولاد بھی وصیت میں شامل ہوں گے۔ کیونکہ عتق کا سبب یعنی تدبیر و استیلاد ثابت و قائم ہے۔

اور اس وصیت میں وہ غلام بھی داخل ہوگا جسے آقا نے کہا کہ اگر میں تجھے سزا نہ دوں تو تو آزاد ہے۔ کیونکہ موت سے تھوڑی دیر پہلے جب سزا دینے سے اس کا عجز ثابت ہوجاتا ہے تو آزادی ثابت ہوجاتی ہے۔

اگر موصی کے موالی بھی ہوں اور ان موالی کی اولاد بھی ہو اور اس کے موالاتی موالی بھی ہوں (یعنی جو اس کے ہاتھ پر اسلام لائے ہوں) تو اس وصیت میں اس کے آزاد کردہ موالی اور تبعًا ان کی اولاد داخل ہوگی۔ موالاتی موالی داخل نہ ہوں گے (کیونکہ موالی سے مراد وہ غلام ہیں جو اس کے آزاد کردہ ہوں۔ ان کی اولاد تبعًا داخل ہوگی۔ اسلام لانے والے کو مولی الموالات تو کہا جاتا ہے۔ مگر اسے مطلق مولیٰ نہیں کہہ سکتے)

امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ اس وصیت میں موالی الموالات بھی داخل ہوں گے۔ اور یہ سب وصیت میں شریک ہوں گے کیونکہ اسم مولیٰ کا اطلاق ان سب پر یکساں طور پر ہوتا ہے۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ دونوں فریقوں پر لفظ مولیٰ کے اطلاق کی جہت مختلف ہے۔ یعنی آزاد کیے گئے کو انعام کرنے کی جہت سے مولیٰ کہا جاتا ہے اور موالات والے کو التزام عقد (یعنی اس کے ہاتھ پر اسلام لانے اور معاہدہ کرنے) کی وجہ سے مولیٰ کہتے ہیں اور اعتاق امر لازم ہے (جس کے وقوع کے بعد رجوع نہیں) تو مولیٰ کا لفظ آزاد کردہ شدہ کے لیے بہت مناسب اور موزوں ہوگا۔

آزاد کردہ موالی میں موالی کے موالی داخل نہ ہوں گے۔ کیونکہ موالی الموالی موصی کے موالی نہیں بلکہ وہ تو دوسرے کے موالی ہیں۔ بخلاف اس کے موالی اور موالی کی اولاد کے یعنی اولاد وصیت میں داخل ہوگی۔ کیونکہ موالی کی اولاد بھی اسی موصی کی جانب ہی منسوب ہوتی ہے اس لیے کہ ان کے باپ کی آزادی موصی کی طرف سے پائی گئی۔

بخلاف اس کے جب اس کے موالی نہ ہوں اور نہ ان کی اولاد ہو (تو موالی و الموالی وصیت کے حق دار ہوں گے) اس لیے کہ لفظ موالی موصی کے موالی کے آزاد کردہ لوگوں پر مجازاً بولا جاتا ہے، یعنی وہ بھی مجازاً موصی کے موالی ہوں گے۔ لہٰذا جب موالی کے حقیقی معنی کا اعتبار ممکن نہ ہو تو لفظ کو مجازی معنی کی طرف پھیرا جائے گا۔

اگر صرف ایک شخص ہی موصی کا آزاد کردہ موجود ہو (اور اس نے وصیت میں موالی یعنی لفظ جمع استعمال کیا ہے) البتہ اس کے موالی یعنی آزاد کردہ کے کچھ موالی ہیں تو وصیت میں سے یہ آزاد کردہ نصف کا حق دار ہوگا اور باقی نصف ورثاء کے لیے ہوگا۔ (موالی الموالی کو کچھ نہ ملے گا) کیونکہ حقیقت و مجاز کو ایک جگہ جمع کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

اور موالی کی وصیت میں وہ موالی داخل نہ ہوں گے جن کو موصی کے باپ یا بیٹے نے آزاد کیا ہو۔ کیونکہ یہ لوگ حقیقۃً یا مجازاً کسی طرح بھی موصی کے موالی نہیں ہیں۔ اور موصی اگر ان کی میراث حاصل کرتا ہے تو صرف عصبہ ہونے کی بناء پر کرتا ہے (یہ شرعی اصول ہے کہ اگر آزاد کردہ شخص لاوارث وفات پائے تو اس کی میراث کا حق دار آزاد کرنے والا ہوتا ہے)۔

بخلاف اس غلام کے جو معتق البعض ہو وہ وصیت میں داخل ہوتا ہے کیونکہ معتق ولاء کے ذریعے سے اس کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ (لہٰذا یہ موالی میں داخل ہونے کی بناء پر وصیت میں شامل ہوگا)۔

(کفایہ شرح ہدایہ میں ہے کہ ہدایہ کے کچھ نسخوں میں بخلاف معتق البعض کے الفاظ ہیں۔ لیکن یہ الفاظ درست نہیں بلکہ درست الفاظ یہ ہیں بخلاف المعتق المعتق)

وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

بَابُ الْوَصِيَّةِ بِالسُّكْنٰی وَالْخِدْمَةِ وَالثَّمَرَةِ

مکان میں رہائش، خدمت اور پھلوں کی وصیت کا بیان

مسئلہ: امام قدوریؒ نے فرمایا۔ اپنے غلام کی خدمت اور اپنے مکان کی سکونت کی وصیت معین سالوں کے لیے کرنا جائز ہے اور ہمیشہ کے لیے بھی اس کی وصیت جائز ہے۔ کیونکہ منافع ایسی چیز ہیں کہ جن کی تملیک موصی کی زندگی میں عوض کے ساتھ یا بغیر عوض کے صحیح ہے۔ اسی طرح موصی کی موت کے بعد بھی ایسی تملیک جائز ہوگی۔ کیونکہ موصی کو اس کی احتیاج ہوتی ہے۔ جیسا کہ اموالِ اعیان میں جائز ہوتا ہے (یعنی اموالِ معینہ میں اس طرح کی تملیک جائز ہوتی ہے تو منافع کی تملیک بھی جائز ہوگی) اور یہ مکان یا غلام اپنی منفعت کے حق میں موصی کی ملکیت میں محبوس رہے گا حتّٰی کہ موصیٰ لہٗ، موصی کی ملکیت پر ان منافع کا مالک ہوگا (یعنی غلام یا دار پر ملکیت تو موصی کی ہوگی اور اسی ملکیت کی بناء پر موصیٰ لہٗ صرف منافع کا مالک ہوگا اور منافع کے استعمال کا اہم

موصی کو ملتا رہےگا) جیسے کہ وقف کے منافع وہ شخص جس پر وقف کیا گیا ہو وقف کرنے والے کے حکم ملک پر حاصل کرتا ہے اور یہ وصیت محدود و مقررہ وقت کے لیے ہو یا ہمیشہ کے لیے ہو دونوں طرح جائز ہے۔ جیسا کہ عاریت کا جواز ہوتا ہے کیونکہ ہمارے اصول کے مطابق عاریت تملیک منافع ہے۔ بخلاف میراث کے کہ وہ نیابت و خلافت ہے ہر اس چیز میں مورث جس کا مالک ہوتا ہے۔ اور یہ بات ایسے مالِ عین میں تو ممکن ہے جو باقی رہنے والا ہو لیکن منفعت عین نہیں بلکہ عرض ہے (یعنی جو قائم بالذات نہ ہو بلکہ قائم بالغیر ہو جو باقی نہیں رہتی)۔

اسی طرح غلام کی اُجرت اور مکان کے کرائے کی وصیت بھی جائز ہے۔ کیونکہ اُجرت و کرایہ کا مال ان کے منافع کا عوض ہے تو اس مال پر منافع کا حکم عائد ہوگا۔ اور معنی ان دونوں کو شامل ہے (یعنی منافع ہوں یا ان کی اُجرت دونوں میں وصیت جائز ہے)۔

مسئلہ: امام قدوریؒ نے فرمایا اگر اس وصیت کردہ غلام کا رقبہ یعنی ذات ترکہ کی تہائی سے برآمد ہو (یعنی غلام کی مالیت تہائی کے برابر ہو) تو غلام کو موصیٰ لہٗ کے سپرد کیا جائے گا تاکہ اس سے خدمت لے کیونکہ موصیٰ لہٗ کا استحقاق ترکہ کی تہائی میں ہوتا ہے اور اس حصے میں ورثاء کی مزاحمت نہیں ہوتی۔

اگر موصی کا اور دیگر کوئی مال اس غلام کے سوا نہ ہو تو یہ غلام دو دن ورثاء کی خدمت کرے گا اور ایک دن موصیٰ لہٗ کی۔ کیونکہ موصیٰ لہٗ

کا حق ایک تہائی میں ہے اور ورثاء کا حق دو تہائیوں میں ہے۔
جیسا کہ مال عین کی وصیت کی صورت میں ہوتا ہے اور غلام کو اجزاء
کی صورت میں تین حصوں میں تقسیم کرنا ممکن نہیں۔ کیونکہ غلام قابل تجزی
نہیں۔ تو ہم نے مجبوری کے پیش نظر دونوں کے حق کی حفاظت کرنے
کے مہایات کی صورت اختیار کی (یعنی باری باری سے خدمت لینا)
بخلاف اس صورت کے جب کہ وصیت مکان کی سکونت کی ہو
اور وہ موصی کے تہائی مال سے برآمد نہ ہو (یعنی تہائی ترکہ سے
زائد ہو) تو انتفاع کے پیش نظر مکان کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا
جائے گا۔ کیونکہ مکان کو تین حصوں میں تقسیم کرنا ممکن ہے اور یہی صورت
موصی لہٗ اور ورثاء کے درمیان مساوات قائم کرنے کے لیے مناسب و قرین
قیاس انصاف ہے کیونکہ اس میں ذات اور زمانہ کے لحاظ سے مساوات
متحقق ہو جاتی ہے (یعنی موصی لہٗ اور ورثاء دونوں ایک ہی چیز کی
ذات سے نفع حاصل کرتے ہیں اور دونوں ایک ہی وقت میں نفع
حاصل کر سکتے ہیں) لیکن مہایات کی صورت میں ایک فریق کی بلحاظ
زمانہ تقدیم لازم آتی ہے۔

اگر ورثاء اور موصی لہٗ زمانے کے لحاظ سے مکان میں مہایات کی صورت
اختیار کر لیں تو بھی جائز ہے۔ کیونکہ انہی کو حق انتفاع حاصل ہے
لیکن مذکورہ پہلی صورت عدل و انصاف کے زیادہ قریب ہے اور
ورثاء کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے حصے کے دو ثلث دار کو فروخت،

کردیں۔

امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ انھیں فروخت کرنے کا اختیار ہے کیونکہ یہ دو ثلث انہی کی خصوصی ملکیت ہیں۔ قول ظاہر کی وجہ یہ ہے کہ موصیٰ لہٗ کا پورے مکان کی سکونت کا حق ثابت ہو سکتا ہے بایں طور کہ میت کا کوئی اور مال ظاہر ہو جائے اور یہ مکان ترکہ کی تہائی سے برآمد ہو سکتا ہے۔

نیز موصیٰ لہٗ کو ورثاء کے ساتھ ان کے مقبوضہ حصے میں مزاحمت کا حق اس وقت حاصل ہو جائے گا جب کہ موصیٰ لہٗ کے قبضہ کا حصہ منہدم ہو جائے اور ورثاء کا فروخت کرنا موصیٰ لہٗ کے حق کو باطل کرنے کو متضمن ہو۔ تو ورثاء کو اس بات سے روکا جائے گا (کیونکہ جب موصیٰ لہٗ والا حصہ منہدم ہو جائے اور ورثاء والا حصہ صحیح و سالم ہو تو موصیٰ لہٗ کو اس حصے میں انتفاع سکونت کا حق ہے۔ اگر ورثاء کو فروخت کرنے کا اختیار ہو تو اس سے موصیٰ لہٗ کا حق مٹ جاتا ہے تو ورثاء کو فروخت کا حق نہ ہوگا)

مسئلہ: امام قدوریؒ نے فرمایا اور موصی کی موت کے بعد موصیٰ لہٗ مرگیا تو وہ چیز ورثاء کی طرف لوٹ آئے گی۔ کیونکہ موصی نے موصیٰ لہٗ کے لیے ایک ایسا حق واجب و ثابت کر دیا ہے کہ جس کی بنا پر موصیٰ لہٗ منافع حاصل کرتا رہے بایں طور کہ وہ چیز موصی کی ملکیت پر قائم و برقرار رہے۔ اگر یہ حق موصیٰ لہٗ کے وارث کی طرف منتقل

ہوجائے تو گویا یہ وارث ابتدا ہی سے ان منافع کا مستحق ہوگا حالانکہ موصی کی جانب سے اس کی رضامندی معدوم ہے اور یہ بات جائز نہیں کہ مالک کی رضامندی کے بغیر استحقاقِ ملک حاصل ہوجائے۔

اگر موصٰی لہٗ موصی کی زندگی میں مرگیا تو وصیت باطل ہوجائے گی کیونکہ وصیت کا لازم آنا تو موصی کی موت سے معلق تھا جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں۔

اگر ایک شخص نے کسی کے لیے غلام کی اجرت یا مکان کے کرائے کی وصیت کی۔ لیکن موصٰی لہٗ نے بذاتِ خود اس غلام سے خدمت لی یا بنفسہٖ اس مکان میں سکونت اختیار کرلی تو ابوبکر الاسکاف کے نزدیک جائز ہوگا۔ کیونکہ انتفاع کا مقصد پورا کرنے کے لیے منافع کی قیمت بھی بعینہٖ منافع کی طرح ہوتی ہے۔ لیکن صحیح تر بات یہ ہے کہ موصٰی لہٗ کے لیے ایسا کرنا جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ اجرت یا کرایہ دراہم ہوں گے یا دینار اور وصیت انہی کی واجب و ثابت تھی اور موصٰی لہٗ نے درہم و دینار کی بجائے منافع حاصل کیے ہیں حالانکہ درہم و دینار اور منافع میں باہمی مغائرت ہے اور ورثاء کے حق میں تفاوت ہے۔

کیونکہ اگر بعد میں میت پر قرضہ ثابت ہوجائے تو موصٰی لہٗ سے غلام کی اجرت یا مکان کا کرایہ واپس لینے سے ورثاء میت کا قرض ادا کرسکتے ہیں۔ لیکن موصٰی لہٗ کے منافع حاصل کرنے کی صورت

یہ قرض کی ادائیگی ممکن نہیں رہتی۔

اور اس موصٰی لہ کو جس کو خدمت یا سکونت کی وصیت کی گئی ہے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ غلام یا مکان کو اجرت پر دے دے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس کو ایسا کرنے کا اختیار ہے۔ کیونکہ موصٰی لہ وصیت کی بناء پر منفعت کا مالک ہے۔ اسی طرح وہ کسی دوسرے کو عوض کے ساتھ یا بغیر عوض کے مالک بنانے کا حق دار ہوگا کیونکہ امام شافعیؒ کے نزدیک منافع کو بھی اعیان کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ بخلاف عاریت کے یعنی مستعار چیز کسی دوسرے کو عاریت پر نہیں دی جاسکتی ہے کیونکہ عاریت حضرت شافعیؒ کے نزدیک منافع کی اباحت و اجازت کا نام ہے تملیک کا نہیں۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ وصیت نام ہے تملیک یعنی مالک بنانے کا بغیر عوض کے جو زمانہ بعد الموت کی طرف مضاف ہے تو موصٰی لہ کو عوض کے ساتھ تملیک کا اختیار نہ ہوگا عاریت کے مسئلہ پر قیاس کرتے ہوئے کیونکہ ہمارے اصول کے مطابق عاریت بحالت حیات تملیک بغیر بدل کا نام ہے۔ اور مستعیر کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ عاریت پر لی ہوئی چیز کو اجارے پر دے کیونکہ کسی چیز کو اجارے پر تملیک بالعوض ہے تو وصیت کا بھی یہی حکم ہے۔

اس کی تحقیق یہ ہے کہ جو تملیک بالعوض ہوتی ہے وہ لازمی ہوتی ہے (جیسے بیع و اجارہ وغیرہ) اور جو تملیک بالعوض نہ ہو وہ لازمی

نہیں ہوتی (جیسے عاریت وہبہ وغیرہ) اور کوئی شخص کسی کمزور سبب کے ذریعے قوی کا مالک نہیں ہو سکتا اور نہ قلیل کے ذریعے کثیر کا۔ اور وصیت ایسا تبرع واحسان ہے جو لازم نہیں۔ البتہ وصیت سے رجوع کرنے کا اختیار متبرع کو ہوتا ہے کسی دوسرے کو نہیں ہوتا۔ لیکن متبرع یعنی موصی کے لیے موت کے بعد رجوع کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے کہ رجوع کا حق منقطع ہو چکا ہے (کیونکہ اگر موصی زندہ ہوتا تو رجوع کر سکتا تھا لیکن موصی کی موت سے یہ امکان جاتا رہا اور وصیت قائم رہی۔) لیکن وصیت اپنی اصل اور وضع کے لحاظ سے لازمی نہیں ہوا کرتی۔ (جس طرح بیع وغیرہ انعقاد کے بعد لازم ہو جاتی ہیں)

دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے اصول کے مطابق منفعت مال نہیں ہے۔ اور اس منفعت کی مال کے عوض تملیک کی صورت میں اس میں مالیت کی صفت پیدا کرنا لازم آتا ہے۔ کیونکہ عقد معاوضہ میں مساوات کا ثابت کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن منافع میں مالیت کی صفت پیدا کرنے کی ولایت دو شخصوں کو ہوتی ہے۔ ایک تو اس شخص کے لیے جو کسی عین چیز کی ملکیت کے تابع بنا لیتے ہوئے منافع کا مالک ہو (جیسے مشتری) دوسرے اس شخص کو جو عقد معاوضہ کی بنا پر منافع کی ملکیت حاصل کرے۔ تو ان دونوں شخصوں کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ اسی صفت کے ساتھ دوسرے کو بھی اس منفعت کا مالک بنا سکتا ہے۔ جس وصف کے ساتھ وہ خود اس کا مالک

ہوا تھا۔ لیکن جب ایک شخص محض ان منافع کے مقصود ہونے کی حیثیت سے بغیر عوض کے ان کی ملکیت حاصل کرے (یعنی یہ منافع کسی دوسری عین چیز کے ضمن میں حاصل نہ ہوں بلکہ ان کو مقصودی طور پر حاصل کیا جائے) پھر وہ دوسرے کو بالعوض مالک بنانا چاہتا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ یہ شخص خود جس چیز کا مالک بنا ہے۔ اس سے زائد کا دوسرے کو مالک بنانا چاہتا ہے اور یہ جائز نہیں۔

موصٰی لہٗ کے لیے یہ جائز نہیں کہ موصٰی بہٖ غلام کو کوفہ سے باہر لے جائے (یعنی موصی خود کوفہ کا رہنے والا ہے) البتہ اگر موصٰی لہٗ اور اس کے اہل وعیال کوفہ کے علاوہ کسی اور شہر میں رہتے ہوں تو اس صورت میں وہ اسے کوفہ سے نکال کر اپنے اہل وعیال کے پاس لے جا سکتا ہے تاکہ وہاں ان کی خدمت کرے بشرطیکہ غلام تہائی ترکہ سے برآمد ہو۔ کیونکہ موصی کے جس مقصد کا پتا چلتا ہے وصیت اسی مقصد پر نافذ کی جاتی ہے۔ جب کہ موصٰی لہٗ کے اہل وعیال اسی شہر میں مقیم ہوں تو موصی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ موصٰی لہٗ کو غلام کی خدمت لینے کا اسی شہر میں اختیار دے بدون اس کے کہ غلام کے ذمہ سفر کی مشقت ڈالے۔

لیکن جب موصٰی لہٗ کے اہل وعیال دوسرے شہر میں ہوں تو اس وقت موصی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس غلام کو اپنے اہل وعیال میں لے جائے تاکہ یہ وہاں جا کر ان کی خدمت کرے۔

اگر موصی اپنے غلام کی اجرت یا مکان کے کرائے کی وصیت کرے۔ تو یہ بھی جائز ہے کیونکہ اجرت یا کرایہ منفعت کا بدل ہے تو اس پر بھی منفعت کا حکم جاری ہوگا کہ اس میں بھی وصیت جائز ہے اور یہ جواز کیوں نہ ہو۔ حالانکہ یہ اجرت وکرایہ در حقیقت مالِ عین ہے کیونکہ یہ دراہم و دنانیر ہے۔ لہٰذا ان کی وصیت بدرجہ اولیٰ جائز ہوگی۔

اگر اس غلام یا مکان کے علاوہ موصی کا کوئی اور مال نہ ہو تو موصیٰ لہٗ ایک سال کی اجرت کی تہائی کا مستحق ہوگا کیونکہ اجرت وکرایہ مال عین ہے جس کو حصوں کی صورت میں تقسیم کرنا ممکن ہے۔

اگر موصیٰ لہٗ چاہے کہ اس مکان کو اپنے اور ورثاء کے درمیان تقسیم کرے تاکہ موصیٰ لہٗ مستقل طور پر اس مکان کی تہائی حصے کی کمائی حاصل کرتا رہے تو امام ابو یوسفؒ کی ایک روایت کے علاوہ موصیٰ لہٗ کے لیے ایسا کرنے کا جواز نہ ہوگا۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ موصیٰ لہٗ مکان میں وارث کے ساتھ شریک ہے اور شریک کو تقسیم دار کا حق ہے اس لیے موصیٰ لہٗ کو بھی یہ حق حاصل ہوگا۔

مگر ہم کہتے ہیں کہ تقسیم کا مطالبہ اس بناء پر ہو سکتا ہے کہ جس چیز کی تقسیم ہو اس میں موصیٰ لہٗ کا حق ثابت ہو کیونکہ قابلِ مطالبہ یہی چیز ہے اور یہ امر واضح ہے کہ موصیٰ لہٗ کا عینِ دار میں کوئی حق نہیں۔ کیونکہ اس کا حق تو مکان کی اجرت میں ہے۔ لہٰذا مکان کی

تقسیم کے مطابق بیے کا حق دار نہ ہوگا۔

اگر موصی ایک شخص کے لیے غلام کی خدمت کی وصیت کرے اور دوسرے کے لیے اس کی گردن یعنی ذات کی وصیت کرے بشرطیکہ وہ غلام تہائی ترکہ سے برآمد ہوتا ہے تو غلام کی ذات اس شخص کے لیے ہوگی جس کے لیے ذات کی وصیت کی گئی ہے۔ اور صاحب خدمت کے لیے غلام پر خدمت کرنا واجب ہوگا۔ کیونکہ نے دونوں میں سے ہر ایک کے لیے ایک معلوم چیز واجب کی۔ اس لیے کہ اس نے ایک چیز کا دوسری پر عطف کیا ہے۔ لہٰذا اس حالت کو انفراد کی حالت پر قیاس کیا جائے گا (یعنی اگر تنہا ایک شخص کے لیے ذات کی وصیت ہو تو صحیح ہے یا تنہا ایک شخص کے لیے خدمت کی وصیت ہو تو بھی صحیح ہے اور دونوں کو بطریق عطف جمع کر کے وصیت بھی صحیح ہوگی) جب صاحب خدمت کے لیے وصیت صحیح ہے پس اگر اس کی ذات کی کسی کے لیے بھی وصیت نہ کرے تو اس کی ذات ورثاء کی میراث ہوگی اور خدمت کا حق موصیٰ لہٗ کو ہوگا۔

اسی طرح جب کسی دوسرے کے لیے ذات کی وصیت کرے۔ (تو غلام کی ذات ایک موصیٰ لہٗ کے لیے ہوگی اور حق خدمت دوسرے کے لیے) کیونکہ وصیت میراث کی بہن ہے اس لیے کہ ان دونوں میں ملکیت موصی کی موت کے بعد ثابت ہوتی ہے۔ اور اس مسئلہ کی اور بھی کئی نظریں ہیں۔ من جملہ ان نظائر کے ایک یہ ہے کہ مثلاً ایک

باندی کی وصیت ایک شخص کے لیے کی اور جو اس کے پیٹ میں حمل ہے اس کی وصیت دوسرے کے لیے کی حالانکہ باندی تہائی ترکہ سے برآمد ہوتی ہے (تو وصیت درست ہوگی۔ ایک موصٰی لہٗ کے لیے باندی ہوگی اور دوسرے کے لیے حمل)

یا ایک شخص کے لیے انگوٹھی کے حلقہ کی وصیت کی اور دوسرے کے لیے نگینہ کی یا ایک شخص کے لیے اس ٹوکرے کی وصیت کی اور دوسرے کے لیے ان کھجوروں کی جو ٹوکرے میں ہیں۔ تو اس کی وصیت کے مطابق عمل درآمد ہوگا۔ اور ان تمام مسائل میں ظرف والے کے لیے مظروف سے کوئی چیز نہ ہوگی (بلکہ حمل، نگینہ یا کھجوریں دوسرے موصٰی لہٗ کی ہوں گی)

یہ تفصیل اس صورت میں جب کہ موصی عطف سے دونوں باتوں کو متصلاً ذکر کرے۔ لیکن اگر موصی نے دونوں باتوں کے درمیان فصل کیا یعنی ہر بات کو بغیر عطف الگ الگ ذکر کیا تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہی حکم ہے اور امام محمدؒ کے نزدیک باندی موصٰی لہٗ کے لیے ہوگی۔ اور اس کا بچہ دونوں موصٰی لہما کے درمیان نصف نصف ہوگا۔ اور امام محمدؒ کے نزدیک اس کی نظائر میں بھی یہی حکم ہے۔

امام ابو یوسفؒ کی دلیل یہ ہے کہ دوسری کلام میں ایجاب سے یہ ظاہر ہوا کہ پہلے کلام میں موصی کی مراد پہلے موصٰی لہٗ کے لیے باندی کی وصیت ثابت کرنا ہے۔ نہ کہ بچے کی۔ اور یہ بیان موصی کی طرف سے صحیح ہے۔ اگرچہ دوسرا بیان پہلے سے الگ ہو۔ کیونکہ وصیت

بحالتِ حیات کوئی شے لازم کرنے والی نہیں ہوتی تو متصل اور منفصل بیان برابر ہوتے ہیں۔ جیساکہ غلام کی ذات اور خدمت کے بارے میں اتصال وانفصال کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔

امام محمدؒ کی دلیل یہ ہے کہ اسم خاتم یعنی انگوٹھی حلقے اور نگینے دونوں پر بولا جاتا ہے۔ اسی طرح اسم جاریہ اس کی ذات اور جو اس کے پیٹ میں ہے دونوں پر بولا جاتا ہے۔ اسم قوصرہ یعنی ٹوکرے کی بھی یہی صورت ہے اور یہ ہمارا مسلمہ اصول ہے کہ ہر وہ عام جس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اس کا حکم بطور احاطہ یعنی عموم کے ساتھ ثابت ہو تو ایسا عام خاص کے درجہ میں ہوتا ہے۔ اس قانون کے پیشِ نظر نگینے میں دو وصیتیں ہوئیں یعنی ایک موصیٰ لہٗ کے لیے بھی اور دوسرے موصیٰ لہٗ کے لیے بھی۔ اور دونوں میں سے ہر ایک ایجاب علیحدہ وصیت ہے۔ تو نگینہ دونوں کے درمیان نصف نصف ہوگا۔ اور نگینہ میں دوسرے کے لیے وصیت کرنا پہلے سے رجوع نہ ہوگا۔ جیساکہ اگر دوسرے کے لیے انگوٹھی کی وصیت کرتا تو یہی حکم ہوتا (کہ دوسرے کے لیے وصیت کرنے سے پہلے رجوع نہ ہوتا) لیکن ذات اور خدمت کا حکم اس سے مختلف ہے۔ کیونکہ اسم رقبہ خدمت کو شامل نہیں موصیٰ لہٗ کے لیے خدمت کا استحقاق صرف اس حکم سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ منفعت اس کی ملکیت پر حاصل ہوتی ہے لیکن جب موصی نے خدمت کا حق کسی اور کے لیے واجب کر دیا تو اس موصیٰ لہٗ کے لیے خدمت

لینے کا کوئی حق نہ ہوگا جس کے لیے ذات کی وصیت کی گئی ہے۔
بخلاف اس کے اگر دوسری کلام پہلی کلام سے متصل ہو (تو پھر ایک کے لیے اپنی اپنی وصیت بدوان شرکت ہوگی) کیونکہ متصل کلام میں اس طرح وصیت کرنا تخصیص واستثنار کی دلیل ہے۔ تو ظاہر ہوا کہ موصی نے جس شخص کے لیے انگشتری کی وصیت کی ہے اس کے لیے صرف حلقے کا ایجاب کیا ہے نہ کہ نگینے کا۔

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا۔ اگر موصی نے ایک شخص کے لیے باغ کے پھلوں کی وصیت کی پھر موصی مر گیا حالانکہ باغ میں پھل موجود ہیں تو یہ موجود پھل موصٰی لہٗ کے لیے ہوں گے۔ اگر موصی نے یوں کہا کہ میرے باغ کے پھل ہمیشہ کے لیے فلاں کے لیے وصیت ہیں تو موصٰی لہٗ کے لیے موجودہ پھل بھی ہوں گے اور جو پھل آئندہ ہوں گے وہ بھی موصٰی لہٗ کی زندگی بھر اسی کے لیے ہوں گے۔ دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ عرف میں ثمرہ ان پھلوں کا نام ہے جو موجود ہوں اور معدوم پھل اس میں شامل نہ ہوں گے۔ ہاں اگر کسی زائد لفظ کی دلالت ہو مثلاً دوام کی تصریح کر دی جائے تو اس صورت میں معدوم بھی شامل ہوں گے۔ کیونکہ موجودہ پھلوں کے لیے تو دوام نہیں ہوتا۔ دوام اس طرح ہو سکتا ہے کہ معدوم پھلوں کو بھی شامل کر لیا جائے۔ معدوم اگرچہ کچھ چیز نہیں لیکن وہ مذکور ہوتا ہے (یعنی جب معدوم پھلوں کا بیان میں ذکر کرنا ممکن ہے تو ان کا وصیت

میں شامل کرنا بھی ممکن ہے) لیکن لفظ اُجرت عرف میں موجود کو بھی شامل ہوتا ہے اور اس کو بھی جو لمحہ بلمحہ معرض وجود میں آنے والی چیز ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص اپنے باغ کی کمائی کھاتا ہے (تو اس میں موجود و معدوم قسم کی دونوں کمائی شامل ہوتی ہیں)۔

لہٰذا جب اجرت کے لفظ کا اطلاق کیا جاتا ہے تو وہ عرف کے لحاظ سے موجود و معدوم دونوں کو شامل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور لفظ کی ضرورت نہیں ہوتی جو آئندہ پر دلالت کرے لیکن جب لفظ ثمرہ بولا جاتا ہے تو اس سے موجود پھل ہی مراد ہوتے ہیں۔ لہٰذا دوام ثابت کرنے کے لیے ایک زائد دلیل کی ضرورت ہوگی (اس لیے ہمیشہ ابداً، دائماً وغیرہ کے الفاظ استعمال کرنا پڑے گا)

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا۔ اگر ایک شخص نے کسی دوسرے کے لیے وصیت کی کہ میری بکریوں کی صوف ہمیشہ اس کے لیے ہوگی۔ یا بکریوں کے بچوں یا ان کے دودھ کی وصیت کی۔ پھر موصی مر گیا تو موصی لہٗ کو وہ بچے ملیں گے جو اس وقت بکریوں کے پیٹ میں ہیں۔ یا وہ دودھ جو بکریوں کے تھنوں میں ہے۔ یا وہ صوف جو اس وقت ان کی کھالوں پر ہے۔ اس دن جب کہ موصی مرا ہے۔ خواہ موصی نے دوام کا لفظ استعمال کیا ہو یا نہ۔ کیونکہ وصیت بوقت موت ایجاب کا نام ہے۔ لہٰذا ان اشیاء کا موت کے وقت

قیام و وجود ضروری ہوگا۔

اور یہ حکم اس مسئلہ کے جو سابق میں گزر چکا ہے خلاف ہے۔ دونوں مسئلوں میں وجۂ فرق یہ ہے کہ قیاس معدوم شے کی تملیک کا مقتضی نہیں۔ کیونکہ معدوم شے میں قبولِ ملک کی اہلیت نہیں ہوتی۔ لیکن پھل اور اجرت وغیرہ کو اس حکم سے اس لیے مستثنیٰ قرار دیا گیا کہ شریعت نے ان پر عقد و معاملہ کی اجازت دی ہے۔ جیسے زمینوں کی بٹائی کا معاملہ یا عقد اجارہ۔ یا مساقات و مزارعت وغیرہ۔ تو اس بات کا مقتضیٰ یہ ہوا کہ یہ صورت وصیت میں بدرجۂ اولیٰ جائز ہو۔ کیونکہ وصیت کا باب زیادہ وسیع ہے۔

لیکن بکریوں کے معدوم بچے۔ اور اس کے ساتھ مذکورہ دو چیزیں یعنی صوف اور دودھ تو ان پر عقد کا وارد کرنا جائز ہی نہیں ہوتا۔ اور ان کا استحقاق کسی عقد سے جائز نہیں ہوتا۔ تو یہ معدومات وصیت کے تحت بھی داخل نہ ہوں گے۔ البتہ ان میں سے جو چیزیں موجود ہیں ان کا عقدِ بیع کے ذریعے تابع کر کے استحقاق حاصل ہو جاتا ہے (جیسا کہ حاملہ بکری کی خرید حمل بھی تبعاً بیع میں داخل ہوتا ہے) اور عقدِ خلع میں مقصود بالذات ہونے کی جہت سے (یعنی اگر عورت باندی کے حمل پر خلع کرے تو جائز ہے) تو اسی طرح وصیت سے ان کی ملکیت موصیٰ لہٗ کو حاصل ہو جائے گی۔

وَاللّٰہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

بَابُ وَصِيَّةِ الذِّمِّي

ذمّی کی وصیّت کے بیان میں

مسئلہ:۔ جب کسی یہودی نے بحالت صحت بیعہ (معبد) تعمیر کیا یا نصرانی نے بحالت صحت کنیسہ تعمیر کیا۔ وہ یہودی یا نصرانی مرگیا۔ تو یہ اس کے ورثاء کے لیے میراث ہو گا۔ کیونکہ ذمی کا یہ فعل امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بمنزلہ وقف ہے اور امامؒ کی رائے میں وقف لازم نہیں ہوا کرتا بلکہ میراث ہو جاتا ہے۔ تو یہودی و نصرانی کے وقف کا بھی یہی حکم ہو گا۔

صاحبینؒ کے نزدیک بیعہ یا گرجا اس لیے میراث ہو گا کہ ایسی عبادت گاہ کا بنانا جس میں غیر اللہ کی عبادت مقصود ہو معصیت ہے۔ لہذا اس پر وقف کے احکام کا اجراء مناسب نہ ہو گا۔

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا اگر یہودی یا نصرانی نے معینہ قوم کے لیے بیعہ یا گرجا کی وصیت کی تو یہ وصیت ترکہ کے

ثلث سے جائز ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اس نے وصیت کی کہ اس کا یہ مکان بیعہ یا گرجا بنا دیا جائے تو یہ وصیت ترکہ کی تہائی سے جائز ہوگی۔ کیونکہ وصیت میں استخلاف کے معنی بھی پائے جاتے ہیں اور تملیک کے معنی بھی پائے جاتے ہیں۔ اور ذمی کو ان میں سے ہر ایک پر ولایت بھی حاصل ہے تو دونوں معنوں کے پیش نظر اس کے تصرّف کو صحیح قرار دیا جا سکتا ہے۔

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے فرمایا۔ اگر ذمی نے کسی غیر معین قوم کو اپنے مکان کو بیعہ یا گرجا میں تبدیل کرنے کی وصیت کی تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وصیت جائز ہوگی۔ صاحبینؒ نے فرمایا کہ وصیت باطل ہوگی۔ کیونکہ ایسی عبادت گاہوں کی تعمیر حقیقت کے پیش نظر معصیت ہے۔ اگرچہ ان کے معتقدات کے مطابق باعث قربت واجر ہے۔ اور باطل چیز کی وصیت کرنا باطل ہے کیونکہ اگر ایسی وصیت کو نافذ کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم معصیت میں مزید استحکام پیدا کر رہے ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ ایسی عبادت گاہوں کی تعمیر یہود و نصاریٰ کے معتقدات میں قربت کا درجہ رکھتی ہے اور ہم مسلمانوں کو شریعت کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم ان کو ان کے مذہبی عقائد کے سلسلے میں آزاد چھوڑ دیں (اور ان سے تعرض نہ کریں) تو ان کے عقیدے کی بناء پر وصیت جائز ہوگی۔ کیا آپ

کو معلوم نہیں کہ اگر یہودی یا نصرانی ایسی عبادت گاہ (مثلاً مسجد)
کی وصیت کرے اگرچہ یہ وصیت درحقیقت قربت ہے۔ لیکن
ان کے معتقدات میں معصیت ہے تو ان کے عقائد کا اعتبار کرتے
ہوئے ایسی وصیت جائز نہ ہوگی (یعنی غیر مسلم اگر مسجد کی تعمیر کی
وصیت کرے تو اس کی وصیت قابل عمل نہ ہوگی کیونکہ مسجد کی تعمیر ان
کے اعتقاد کے لحاظ سے معصیت ہے) اور اس کے عکس میں بھی یہی
حکم ہوگا (کہ ان کے معتقدات کے مدنظر مکان کو بیعہ یا گرجے میں تبدیل
کرنے کی وصیت جائز ہوگی) دونوں صورتوں میں امام ابوحنیفہؒ کے
نزدیک فرق یہ ہے۔ پہلی صورت کہ بیعہ یا گرجا بنانے کی وصیت
جائز ہے۔ دوسری صورت کہ اگر بیعہ یا گرجا بنا کر مر جائے تو وہ
میراث ہوگا۔

عمارت ایسی چیز نہیں جو بانی کی ملکیت کے زائل ہونے کا سبب
بن جائے۔ بلکہ بانی کی ملکیت اس وقت زائل ہو جاتی ہے جب کہ
وہ خالصتاً اللہ تعالیٰ کا حق ہونے کی وجہ سے محفوظ ہو جائے جیسا
کہ مسلمانوں کی مساجد (کہ جب ایک شخص صرف اللہ کی رضا اور اس
کی عبادت کی خاطر ایک مسجد بنوا دے تو وہ مسجد بندوں میں سے
کسی کی ملکیت نہیں رہتی بلکہ جو شخص چاہے وہاں آکر فریضۂ عبادت
ادا کر سکتا ہے) لیکن گرجا خالصتاً اللہ تعالیٰ کا حق بن کر محفوظ نہیں
ہوتا کیونکہ اسے تو غیر اللہ کی عبادت کے لیے تعمیر کیا جاتا ہے)

لہٰذا وہ بنانے والے کی ملکیت پر باقی رہے گا۔ اور میراث میں اس کے ورثاء کو دیا جاسکے گا۔

دوسری بات ہے کہ یہود و نصاریٰ اپنی عبادت گاہوں کے ساتھ ساتھ گھر بھی بناتے ہیں جن میں وہ سکونت اختیار کرتے ہیں تو اس لحاظ سے خالصۃً لحق اللہ محفوظ نہ ہوا۔ کیونکہ اس کے ساتھ حقوق العباد بھی متعلق ہیں۔ اس صورت میں تو مسجد بھی میراث میں آجاتی ہے۔ (مثلاً کسی نے اپنے مکان کو مسجد بنایا اس کے اوپر والے یا نچلے حصے میں رہائش رکھی تو یہ مسجد میراث میں ورثاء کو دی جائے گی) کیونکہ خالصۃً لحق اللہ محفوظ نہ ہوئی۔ بخلاف وصیت کے یعنی جب بیعہ یا گرجا کی وصیت کرے تو یہ وصیت جائز ہوگی اور عبادت گاہ ملکیت سے نکل جائے گی۔ کیونکہ وصیت تو ازالۂ ملکیت کے لیے ہی موضوع ہے۔ البتہ اتنی بات ہے کہ اس کے مقتضیٰ (یعنی ازالہ ملک کا حکم) کا ثابت ہونا اس صورت میں ممنوع ہوگا جب کہ وہ ایسی چیز کی وصیت کرے جو ان کے نزدیک قربت نہ ہو۔ تو اس وصیت کا مقتضیٰ اس چیز تک محدود رہے گا جو قربت ہے۔ اور ایسی وصیت سے ملک زائل ہو جائے گا اور اسے میراث میں نہیں دی جائے گی۔

صاحب ہدایہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں حاصل کلام یہ ہے کہ ذمیوں کی وصیت کی چار قسمیں ہیں۔

اوّل۔ ایسی چیز کی وصیت جو ان کے اعتقاد میں قربت ہو اور

ہمارے اعتقاد میں قربت نہ ہو۔ اس کی توضیح ابھی گزر چکی ہے۔

دوم۔ ذمی نے وصیت کی کہ اس کے خنزیر ذبح کر کے مشرکین کو کھلائے جائیں ایسی وصیت میں امامؒ اور صاحبینؒ کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے جبکہ وہ لوگ جن کے لیے وصیت کی گئی ہے غیر معین ہوں۔ جیسا کہ ہم مذکورہ بالا سطور میں بتا چکے ہیں اور باہمی دلائل کا تذکرہ بھی کر دیا گیا ہے۔

سوم۔ ذمی ایسی چیز کی وصیت کرے جو ہمارے نزدیک قربت ہے لیکن ان کے اعتقاد میں قربت نہ ہو۔ جیسے کہ ذمی حج کی وصیت کرے یا مسلمانوں کے لیے تعمیر مسجد کی۔ یا مسلمانوں کی مساجد میں چراغ جلانے کی۔ ان کے اعتقاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ وصیت بالاتفاق باطل ہے البتہ اگر ایسی وصیت کسی معین قوم کے لیے ہو تو جائز ہو گی بطور تملیک کے۔ کیونکہ یہ لوگ معلوم و معین ہیں اور ان کی بات کو مشورہ قرار دیا جائے گا (مثلاً ایک ذمی نے ایک شخص کو حج کرانے کی وصیت۔ تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ فلاں شخص کو اتنا مال دیا جائے کہ وہ فریضہ حج ادا کر سکے یہ میرا مشورہ ہے معین شخص کے لیے یہ وصیت تملیک مال ہو گی اور حج کا ذکر بطور مشورہ ہے)

چہارم۔ اگر ذمی ایسی چیز کی وصیت کرے جو ان کے نزدیک بھی قربت ہو اور ہمارے نزدیک بھی قربت ہو جیسے وصیت کی کہ بیت المقدس میں چراغ جلایا جائے یا رومی یہودی نے وصیت کی کہ میرا مال تا تاریوں

کے خلاف جہاد کرنے پر خرچ کیا جائے۔ تو یہ جائز ہے۔ خواہ اس نے معین قوم کے لیے وصیت کی یا غیر معین قوم کے لیے کیونکہ یہ وصیت ایسی چیز کی ہے جو درحقیقت بھی قربت ہے اور ان کے اعتقاد میں بھی قربت ہے۔

وصیت کے چار اقسام کے علاوہ ایک قسم یہ بھی ہے کہ ذمی ایسی چیز کی وصیت کرے جو نہ ان کے نزدیک قربت ہو اور نہ ہمارے نزدیک۔ جیسے گانے والی اور نوحہ کرنے والی عورتوں کے لیے وصیت کرے۔ تو یہ وصیت جائز نہیں کیونکہ ایسی چیز ان کے نزدیک بھی معصیت ہے اور ہمارے نزدیک بھی۔ البتہ اگر ایسی وصیت کسی معین قوم کے لیے کی گئی تو جائز ہوگی۔ تملیک اور استخلاف ہونے کے لحاظ سے۔

ہوائے نفس کی اتباع کرنے والا شخص (بدعتی ہو یا ملحد) اگر اس میں کفر تک پہنچنے والا نہیں ہے تو وصیت کے معاملات میں وہ مسلمانوں کی طرح ہوگا۔ کیونکہ ہمیں شریعت نے حکم دیا ہے کہ ہم احکام کو ظاہر حال پر مبنی کریں۔ اگر ہوائے نفس کی پیروی کی وجہ سے اس کی تکفیر کی گئی تو وہ بمنزلہ مرتد ہے اور اس کے تصرفات اس اختلاف پر محمول ہیں جو امام اور صاحبین کے درمیان بیان کیا گیا ہے۔

مرتدہ عورت کے بارے میں صحیح تر قول یہ ہے کہ اس کی وصیتیں صحیح ہوں گی۔ کیونکہ اسے اپنے ارتداد پر چھوڑا جاتا ہے۔ بخلاف

مرتد مرد کے کیونکہ اسے یا تو اسلام لانا ہوتا ہے یا قتل کردیا جاتا ہے۔

مسئلہ: امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا۔ اگر کوئی حربی امان لے کر دارالاسلام میں داخل ہوا اور اس نے کسی مسلمان یا کسی ذمی کے لیے اپنے سارے مال کی وصیت کی۔ تو جائز ہوگی۔ کیونکہ تہائی مال سے زیادہ کی وصیت کا امتناع وارثوں کے حق کے مدنظر ہوتا ہے اور امان لے کر آنے والے حربی کے ورثاء کا کوئی قابل رعایت حق نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ دارالحرب میں مقیم ہیں اور ہمارے نزدیک مُردوں کی طرح ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ حربی متأمن کے مال کی حرمت امان حاصل کرنے کے اعتبار سے ہے اور یہ امان صرف اس کے حق کے لیے ہے ورثاء کے حق کے لیے نہیں۔

اگر حربی اس مال میں سے تھوڑے مال کی وصیت کرے تو وصیت کے مطابق مال لے لیا جائے گا اور باقی اس کے ورثاء کو واپس کر دیا جائے گا۔ اور یہ واپس کرنا بھی اس حربی کے حق کے پیش نظر ہے۔ ورثاء کے حق کے پیش نظر نہیں۔

اگر حربی نے دارالاسلام میں موت کے وقت اپنا غلام آزاد کیا یا دارالاسلام میں مرض الموت میں اپنے غلام کو مدبّر بنایا۔ تو اس کی طرف سے یہ تصرف صحیح ہوگا۔ تہائی مال کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا (یعنی بحالت مرض اگر مسلمان غلام کو آزاد

کرے یا مدبر بنائے تو اس کا تہائی مال سے اعتبار کیا جاتا ہے۔ ورثاء کے حق کے مد نظر۔ لیکن حربی کے سلسلے میں تہائی کا اعتبار نہ ہوگا کیونکہ دارالاسلام میں اس کے ورثاء کا کوئی حق ہی نہیں)

اس طرح اگر کوئی مسلمان یا ذمی حربی متامن کے لیے وصیت کرے تو جائز ہوگی۔ کیونکہ جب تک وہ دارالاسلام میں مقیم ہے تو وہ معاملات میں ذمی کی طرح ہے۔ اسی بناء پر اس کی طرف سے تملیک کے تمام عقود (خرید و فروخت اور اجارہ وغیرہ) اس کی زندگی میں صحیح ہوتے ہیں اور زندگی میں اس کا تبرع بھی صحیح ہے تو موت کے بعد بھی صحیح ہوگا۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ نے فرمایا کہ مسلمان یا ذمی کی طرف سے حربی کے لیے وصیت جائز نہ ہوگی۔ کیونکہ وہ حربی کافروں میں سے ایک متامن شخص ہے اور وہ واپسی کے ارادے کے ساتھ یہاں مقیم ہے۔ اسی لیے اسے واپسی کا اختیار دیا جاتا ہے اور ٹیکس ادا کرنے کے بغیر وہ ایک سال سے زائد عرصہ دارالاسلام میں نہیں ٹھہر سکتا۔

اگر ذمی نے ثلث مال سے زائد کی وصیت کی یا اپنے کسی وارث کے لیے وصیت کی تو مسلمانوں کی وصیت پر قیاس کرتے ہوئے اس کی وصیت جائز نہ ہوگی۔ کیونکہ ذمیوں نے معاملات میں احکام اسلام کے التزام کا عہد کر رکھا ہے۔

اگر ذمی کسی ایسے شخص کے لیے وصیت کرے جو اس کی ملت کے خلاف ہے تو جائز ہوگا جیسا کہ میراث میں ہوتا ہے۔ اس لیے کہ کفر سب ایک ہی ملت ہے۔

اگر دارالاسلام میں رہنے والے ذمی نے دارالحرب میں مقیم حربی کے لیے وصیت کی تو جائز نہ ہوگی۔ کیونکہ تباین دار (یعنی دونوں کے دار مختلف ہیں) کی وجہ وراثت ممتنع ہے اور وصیت اس کی بہن ہے۔ لہٰذا وراثت کی طرح وصیت بھی ممنوع ہوگی۔

وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ

بَابُ الْوَصِيِّ وَمَا يَمْلِكُهُ

وصی کے احکام اور اس کے اختیارات کا بیان

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا ایک شخص نے ایک آدمی کو مقرر کیا (کہ میری موت کے بعد میرے تمام امور کی نگہداشت کرنا) وصی نے موصی کے سامنے وصی بننا قبول کر لیا۔ اور پیٹھ پیچھے اس امر کو رد کر دیا تو یہ رد صحیح نہ ہوگا کیونکہ میت وصی پر اعتماد کرتے ہوئے سفر آخرت پر روانہ ہو چکا ہے۔ اگر موصی کی غیر موجودگی میں یعنی اس کی پیٹھ پیچھے اس کی زندگی میں یا اس کی موت کے بعد وصی کا رد صحیح قرار دیا جائے تو موصی وصی کی جانب سے دھوکا کھانے والا ہوگا۔ لہٰذا وصی کے رد کرنے کو رد کر دیا جائے گا۔ بخلاف اس وکیل کے جو کسی غیر معین غلام کو خریدنے کے لیے وکیل مقرر کیا جائے یا مؤکل کے مال کو فروخت کرنے کے لیے وکیل بنایا جائے تو مؤکل کی غیر موجودگی میں بھی اس کا رد صحیح ہوتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں

مؤکل کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچتا۔ اس لیے کہ مؤکل ایک زندہ شخصیت جو بنفسہ خود تصرف پر قادر ہے۔

اگر وصی موصی کے روبرو رد کردے تو یہ رد صحیح ہوگا۔ کیونکہ موصی کو اس پر یہ ولایت نہیں کہ وہ اس کی مرضی کے بغیر اس پر کوئی تصرف لازم کردے۔ اور رد کی اس صورت میں دھوکے کا پہلو بھی نہیں۔ کیونکہ اس کی بجائے کسی دوسرے کو وصی مقرر کر سکتا ہے۔

اگر وصی نہ تو رد کرے اور نہ قبولیت کا اظہار کرے یہاں تک کہ موصی مر جائے تو وصی کو اختیار ہوگا چاہے تو وصایت کو قبول کرے اور اگر چاہے تو رد کردے۔ کیونکہ موصی کو التزام تصرف کی ولایت و قدرت حاصل نہیں ہوتی۔ لہٰذا وصی کا اختیار باقی رہے گا۔

اگر وصی نے موصی کے ترکے سے کوئی شئے فروخت کر دی تو وصایت لازم ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ امر وصایت کو اپنے اوپر لازم کرنے اور قبولیت کی دلیل ہے اور موصی کی موت کے بعد بھی قبولیت قابل اعتبار ہوتی ہے۔ وہ بیع جو وصی سے صادر ہو نافذ ہوتی ہے خواہ اسے وصایت کا علم ہو یا نہ ہو۔ بخلاف اس کے اگر وکیل کو وکالت کا علم نہ ہو تو اس کی بیع نافذ نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وصایت اس خلافت و نیابت کا نام ہے جو موت کے بعد کی حالت سے مخصوص ہوتی ہے۔ جب کہ موصی سے ولایت منقطع

ہو جاتی ہے اور وصی کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ جب ثابت ہوا کہ وصایت خلافت ہے تو یہ علم پر موقوف نہ ہوگی جیسا کہ وراثت میں ہوتا ہے (کہ وارث بہرحال وارث ہوتا ہے اسے علم ہو یا نہ ہو) لیکن جہاں تک وکالت کا تعلق ہے تو وکالت کسی کو نائب بنانے کا نام ہے کیونکہ توکیل تو مؤکل کی ولایت قائم ہونے کی حالت میں ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا توکیل علم کے بغیر صحیح نہ ہوگی۔ جیسے خرید و فروخت سے ملک ثابت کرنا علم کے بغیر نہیں ہوتا۔

ہم علم کی صورتیں اور خبر دینے کی شرطیں پوری وضاحت کے ساتھ سابقہ ابواب میں بیان کر چکے ہیں۔

مسئلہ:۔ اگر وصی نے وصایت قبول نہ کی حتیٰ کہ موصی مر گیا یعنی وصی نے پہلے تو کہا کہ میں وصایت قبول نہیں کرتا پھر کہا میں قبول کرتا ہوں تو اسے اس کا اختیار ہوگا بشرطیکہ قاضی نے اسے وصیت سے خارج نہ کر دیا ہو۔ جب اس نے کہا تھا کہ میں قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کے صرف اتنا کہہ دینے سے کہ میں قبول نہیں کرتا وصایت باطل نہیں ہوتی کیونکہ اس کے باطل کرنے میں میت کو ضرر پہنچتا ہے اور وصیت کے باقی رکھنے جو تکلیف وصی کو لاحق ہوتی ہے (کہ اسے اپنے کاموں کے علاوہ موصی کے امور کی نگہداشت بھی کرنا پڑتی ہے) اس کا تدارک بذریعہ ثواب ہو سکتا ہے اور پہلے ضرر (یعنی میت کا ضرر) کو دفع کرنا زیادہ ضروری اور

مناسب ہے کیونکہ یہی ضرر زائد ہے (وصی کی تکلیف کے مقابلے میں)
البتہ جب اس نے کہا کہ میں قبول نہیں کرتا اور قاضی نے اسے وصایت
سے خارج کر دیا تو قاضی کا نکالنا صحیح ہوگا کیونکہ یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں
اجتہاد کا دخل ہے (اور مجتہد فیہ مسئلے میں قاضی کا جیسا حکم ہو نافذ ہو
جاتا ہے) کیونکہ قاضی کو لوگوں سے ضرر کے ازالے کی ولایت حاصل
ہوتی ہے اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وصی وصایت کی
ذمہ داریاں پوری کرنے سے عاجز ہوتا ہے تو ایسی صورت میں
وصایت کا باقی رکھنا باعث ضرر ہوتا ہے تو ایسی صورت میں قاضی
وصی سے ضرر دور کرے گا اور دوسرا شخص مقرر کر دے گا جو میت
کے مال کی نگہداشت کرے اور اس میں تصرف کرے۔ اس طرح موصی
اور وصی دونوں جانبوں سے ضرر دور ہو جائے گا لہٰذا قاضی کا وصی
کو وصایت سے خارج کرنا درست ہوتا ہے۔

اگر وصی قاضی کے اخراج کے بعد کہے کہ میں وصایت کو قبول کرتا
ہوں تو اس کی بات قابل التفات نہ ہوگی۔ کیونکہ وصی نے اس
وقت وصایت قبول کرنا چاہی جب کہ وہ قاضی کے باطل کر دینے
باطل ہو گئی تھی۔

مسئلہ: امام قدوریؒ نے فرمایا۔ اگر کسی شخص نے غلام یا کافر
(ذمی ہو یا مستامن یا حربی) یا فاسق شخص کو وصی مقرر کیا تو قاضی انھیں
وصایت سے خارج کر دے اور کسی دوسرے کو بطور وصی مقرر کرے

امام قدوریؒ کے ان الفاظ سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اصل کے لحاظ سے
وصیت صحیح ہے کیونکہ اخراج ثبوت وصایت کے بعد ہوتا ہے۔
لیکن امام محمدؒ نے مبسوط میں فرمایا ہے کہ ایسی وصیت ہی باطل ہے۔
فقیہ ابو اللیث نے جامع الصغیر کی شرح میں اس اختلاف کو
رفع کرتے ہوئے فرمایا کہ مبسوط کے مسئلے کا معنی یہ ہے کہ ان تینوں
صورتوں میں وصیت اس قابل ہے کہ اسے باطل کر دیا جائے۔
شمس الائمہ سرخسی نے فرمایا کہ غلام کو وصی مقرر کرنے کی صورت
میں باطل کے یہ معنی ہیں کہ وصیت حقیقت کے لحاظ ہی سے باطل
ہے کیونکہ غلام کو نہ تو ولایت حاصل ہوتی ہے اور نہ تصرفات میں
اسے مستقل حیثیت حاصل ہوتی ہے اور دوسری دو صورتوں میں
باطل کا مطلب یہ ہے کہ باطل کی جائے گی۔
بعض حضرات نے کہا کہ کافر کی صورت میں بھی وصایت حقیقۃً
باطل ہوتی ہے کیونکہ کافر کو مسلمان پر ولایت حاصل نہیں ہوتی۔
پہلی روایت کی بناء پر وصایت کی صحت اور پھر وصی کے اخراج
کی وجہ یہ ہے کہ اصل کے لحاظ سے نظر و نگہداشت کی قدرت
ثابت ہے کیونکہ غلام کو تصرفات کی حقیقی قدرت حاصل ہوتی ہے
و غلام اگر سمجھدار اور صالح ہو تو وہ پورے طور سے امور کی نگہداشت
کر سکتا ہے اور ہمارے اصول کے مطابق فاسق شخص کو بھی ولایت
حاصل ہوتی ہے۔ اور جہاں تک کافر کا تعلق ہے تو فی الجملہ کافر

کو بھی کسی نہ کسی حد تک ولایت حاصل ہوتی ہے۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ غلام کی صورت میں نظر و نگہداشت مکمل درجے کی نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کی ولایت اس کے آقا کی اجازت پر موقوف ہوتی ہے۔ نیز آقا کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ آقا اسے ایک بار اجازت دینے کے بعد کسی وقت بھی تصرفات سے روک دے۔

کافر کی صورت میں یہ نقص ہے کہ دینی عداوت اور دشمنی کافر کو اس امر پر آمادہ کر سکتی ہے کہ وہ ایک مسلمان کے حق میں نظر و نگہداشت کو ترک کر دے اور فاسق پر خیانت و بد دیانتی کا الزام عائد ہو سکتا ہے۔ لہٰذا قاضی ان لوگوں کو وصایت سے خارج کر دے گا۔ اور کسی دوسرے اچھے آدمی کو ان کی جگہ مقرر کر دے تاکہ نظر و نگہداشت مکمل طور پر سر انجام پا سکے۔

امام محمدؒ نے مبسوط میں فاسق کے اخراج کے سلسلے میں یہ شرط عائد کی ہے کہ مال کے بارے میں اس کی طرف سے خوف ہو۔ یہ شرط فاسق کو خارج کرنے اور اس کی بجائے کسی صالح شخص کو مقرر کرنے کے لیے عذر بن سکتی ہے۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا جس شخص نے اپنے ہی غلام کو وصی مقرر کیا حالانکہ اس کے ورثاء میں عاقل و بالغ وارث موجود ہیں تو وصیت صحیح نہ ہوگی۔ کیونکہ عاقل و بالغ وارث کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ غلام کو تصرفات سے منع کر دے۔ یا وہ غلام میں اپنے

حصے کو فروخت کر دے اور غلام کو خریدنے والا شخص اپنے حصے کے اس غلام کو تصرفات سے روک دے تو اس صورت میں غلام وصایت کی ذمہ داریوں کی تکمیل سے قاصر ہوگا۔ لہٰذا ایسی وصایت سے فوائد حاصل نہیں کیے جا سکتے۔

اگر تمام ورثاء نابالغ ہوں تو اس صورت میں امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک غلام کو وصی مقرر کرنا جائز ہے۔ لیکن صاحبینؒ عدمِ جواز کے قائل ہیں۔ قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ امام محمدؒ کا قول اس سلسلے میں مضطرب ہے کبھی تو امام ابو حنیفہؒ کے ساتھ مروی ہے اور کبھی امام ابو یوسفؒ کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے۔

قیاس کی وجہ — جو کہ صاحبینؒ سے مروی ہے — یہ ہے کہ غلام میں ولایت کی اہلیت معدوم ہوتی ہے۔ کیونکہ غلامی ولایت کے منافی امر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس صورت میں مملوک کو مالک پر ولایت دینا لازم آتا ہے حالانکہ یہ اصولِ مشروع کے خلاف ہے۔ (کیونکہ شریعت نے مالک کو مملوک پر ولایت دی ہے)

تیسری بات یہ ہے کہ جو ولایت باپ سے صادر ہوتی ہے وہ متجزی و منقسم نہیں ہوتی (بلکہ ایک کامل اکائی اور وحدت ہوتی ہے) حالانکہ غلام کی وصایت کو اعتبار کرنے کی صورت میں ولایت کی تجزی و تقسیم لازم آتی ہے کیونکہ وہ اپنی ذات کو فروخت نہیں کر سکتا۔ اور یہ نقضِ موضوع ہے (یعنی اصل موضوع تو باپ کی ولایت ہے۔

جس نے غلام کو وصی بنایا اور باپ کو مکمل ولایت حاصل تھی کہ اپنے مال سے جو چاہے فروخت کرے۔ غلام کو وصی بنانے کی صورت میں یہ ولایت غلام کی طرف منتقل ہوگئی۔ لیکن غلام اپنے آپ کو فروخت نہیں کرسکتا۔ اس طرح ولایت میں تجزی پیدا ہوگئی تو اس کو وصی بنانے سے نقض موضوع لازم آتا ہے)۔

امام ابوحنیفہؒ اپنی دلیل دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ غلام بھی احکام شرعیہ کا مکلف ہوتا ہے اور تصرفات میں مستقل ہوتا ہے (خصوصًا وصایت کی بناء پر اس کے تصرف میں مستقل حیثیت رکھتا ہے) لہٰذا وہ اہل وصایت ہوگا اور فی الحال کسی دوسرے کو اس پر کوئی ولایت بھی نہیں۔ کیونکہ نابالغ ورثاء اگرچہ مالک ہیں لیکن وہ غلام کو وصایت کے تصرفات سے روکنے پر قادر نہیں تو غلام کے مملوک ہونے اور وصی ہونے میں کوئی منافات نہیں۔

آقا کا اس غلام کو وصی مقرر کرنا اس بات کا پتا دیتا ہے کہ اس میں بچوں کے لیے نگہداشت اور سرپرستی کی اہلیت پائی جاتی ہے۔ تو یہ مکاتب غلام کی طرح ہوگا (اور مکاتب کی وصایت بالاتفاق جائز ہے)۔

وصایت میں تجزی و تقسیم بھی ممکن ہے۔ جیسا کہ امامؒ سے مروی ہے (غایۃ البیان میں اس کی مثال اس طرح دی گئی ہے کہ مثلاً ا نے دو شخصوں کو وصی مقرر کیا کہ ب تو مالِ معین میں وصی ہے اور ج قرضوں

کی وصولی کے لیے وصی ہے۔ ہر وصی اپنے دائرۂ کار کے اندر رہ کر تصرف کرے گا اور نتیجۃً ہر ولایت کے دو حصے ہو گئے) یا ہم کہتے ہیں، (یعنی اگر تسلیم کر جائے کہ ولایت میں تجزّی نہیں ہوتی تو بھی ہم کہہ سکتے ہیں) کہ ایسی صورت کی طرف ضرورت کے پیشِ نظر رجوع کیا جائے گا تاکہ کہیں اصل وصایت کے باطل ہو جانے تک نوبت نہ پہنچے۔ اور ایک وصف میں تبدیلی کرنا کہ جس سے اصل کی درستی ہو سکے۔ اس سے بہتر ہے کہ اصل کو بالکل ہی باطل کر دیا جائے۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا۔ اگر موصی نے کسی ایسے شخص کو وصی مقرر کیا جو وصیت کی ذمہ داریاں پوری کرنے سے عاجز ہے تو قاضی اس کے ساتھ ایک اور مددگار مقرر کر دے۔ موصی اور ورثاء کے حق کی رعایت بھی اسی میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے حق میں نگہداشت اور سرپرستی کی رعایت دوسرے شخص کو ساتھ ملانے سے پوری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ دوسرا مددگار اس کو خیانت و نقصان سے بچائے گا اور بعض امور میں کفایت کرے گا لہٰذا دوسرے کی اعانت سے نگہداشت کے فرائض صحیح طور پر انجام پائیں گے۔

اگر وصی قاضی کے پاس جا کر شکایت کرے کہ میں وصیت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے سے قاصر ہوں تو قاضی فی الحال اس بات تسلیم نہ کرے۔ یہاں تک کہ حقیقتِ حال کی خود تحقیق کرے کیونکہ شکایت کرنے والا بعض اوقات جھوٹ سے کام لیتا ہے تاکہ

اپنے لیے تخفیف اور سہولت حاصل کرلے جب قاضی کو وصی کے قطعاً عجز کا پتا چل جائے تو اس کی جگہ دوسرے آدمی کو بدل کر مقرر کردے تاکہ دونوں جانبوں (یعنی وصی اور ورثا کی جانب) کی رعایت ملحوظ رہے۔

اگر موصی تصرفات پر قادر ہو اور دیانت دار بھی ہو تو قاضی اسے نہیں نکال سکتا۔ کیونکہ اگر قاضی اسے نکال کر دوسرے کو مقرر کرے تو یہ دوسرا پہلے سے درجے میں کمتر ہوگا کیونکہ پہلا وصی تو میت کا اپنا انتخاب کردہ تھا اور اس کے نزدیک پسندیدہ تھا۔ لہٰذا اسے باقی رکھنا ہی مناسب ہے۔ اسی بنا پر ایسے وصی کو باپ پر بھی فوقیت حاصل ہوتی ہے حالانکہ باپ کی شفقت کامل تر ہوتی ہے۔ لہٰذا کسی دوسرے پر مقدم کرنا بدرجۂ اولیٰ مناسب و ضروری ہوگا۔

اسی طرح اگر تمام ورثا، یا ان میں سے بعض قاضی کے پاس شکایت کریں تو قاضی کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وصی کو ان کی بات سن کر فوراً معزول کردے جب تک کہ اس کی خیانت اس پر ظاہر نہ ہو جائے کیونکہ وصی نے یہ ولایت میت کی طرف سے حاصل کی ہے۔ لیکن جب وصی سے خیانت کا ظہور ہو (تو اسے وصایت سے معزول کیا جا سکتا ہے) کیونکہ اس کے ضعفِ امانت کی بناء پر ہی میت نے اسے وصی مقرر کیا تھا۔ اور بد دیانتی کی صورت میں یہ وصف مفقود ہو جاتی ہے۔ اگر موصی خود زندہ ہوتا تو بد دیانتی کا ارتکاب کرنے پر وصی کو یقیناً معزول کر دیتا لیکن جب موصی بوجہ موت اس امر سے عاجز

ہو گیا تو قاضی اس سلسلے میں اس کا قائم مقام ہوگا گویا کہ موصی کا کوئی وصی ہی نہ تھا (کیونکہ بددیانت وصی کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے لہٰذا قاضی اسے معزول کرسکتا ہے)۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا۔ اگر ایک آدمی نے دو شخصوں کو وصی مقرر کیا تو ان میں سے کسی ایک کے لیے دوسرے کی موجودگی کے بغیر تصرف کرنا جائز نہ ہوگا۔ یہ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کی رائے ہے۔ البتہ معدودے چند چیزوں میں اس کا تنہا تصرف بھی جائز ہوتا ہے جیسا کہ ان شاء اللہ عنقریب ہم بیان کریں گے۔

امام ابویوسفؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں میں ہر ایک تمام اشیاء میں مستقل طور پر تنہا تصرف کرنے کا اختیار رکھتا ہے کیونکہ وصایت دراصل ذمہ داری و ولایت سپرد کرنے کا ایک طریق کار ہے۔ اور یہ ولایت ایسا وصف شرعی ہے جس میں تجزی نہیں ہوتی۔ تو ہر ایک وصی کو پوری ولایت حاصل ہوگی۔ جیسے کہ دو بھائیوں کو اپنی بہن کے نکاح کی ولایت حاصل ہوتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وصایت خلافت کا نام ہے اور یہ نیابت و خلافت اسی صورت میں متحقق ہو سکتی ہے جب کہ وصی کی طرف اسی حیثیت سے منتقل ہو جس طرح موصی کو حاصل تھی۔ اور موصی کمال ولایت سے متصف تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ باپ نے جب ان دو شخصوں کو وصایت کے لیے منتخب کیا تو معلوم ہوا کہ باپ کو یہ علم تھا کہ ان میں سے ہر ایک

ورثاء کے ساتھ پوری پوری شفقت رکھتا ہے۔ اس لیے اس شفقت کو ان میں سے ہر ایک کی قرابت کے درجے میں شمار کیا جائے گا (جیسے دو بھائی وصفِ ولایت میں واحد شمار ہوتے ہیں)

امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ وصی کو تصرف کی ولایت سپرد کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ پس سپردگی کے وصف کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ اور اس صورت میں وہ وصف اجتماع ہے یعنی دونوں کو مجتمع طور پر ولایت سپرد کی اور یہ وصف اجتماع ایک مفید شرط ہے اور موصی دونوں کو مجموعی طور پر وصی بنانے پر رضامند ہوا ہے۔

اور یہ بات واضح ہے کہ ایک شخص دو شخصوں کی طرح نہیں ہو سکتا بخلاف دو بھائیوں کے نکاح کے معاملے میں کیونکہ اس صورت میں اصل سبب قرابت ہے۔ اور یہ قرابت ہر ایک بھائی کے ساتھ مکمل و کامل طور پر قائم ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ نکاح ایسی چیز ہے جو عورت کا حق لازم ہے بذمہ ولی۔ حتیٰ کہ اگر عاقلہ و بالغہ عورت ولی سے کفو میں ایسے شخص سے جو پیغام نکاح دے رہا ہے نکاح کر دینے کا مطالبہ کرے تو ولی پر اس کا نکاح کر دینا واجب ہوگا اور یہاں وصی کے لیے کوئی حق نہیں بلکہ وصی کو تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے اس لحاظ سے وصی کو تصرف کا اختیار باقی رہتا ہے اور نکاح کر دینے کی صورت میں یہ ہوتا ہے کہ اگر ایک بھائی نے وہ حق ادا کر دیا جو اس کے ساتھی پر لازم تھا (یعنی نکاح کرانا) تو صحیح ہوگا۔ لیکن وصیت کی

صورت میں ایک وصی نے تصرف کر کے دوسرے وصی کا حق حاصل کر لیا (ادا نہیں کیا) کیونکہ تصرف کا اختیار دونوں کے لیے ثابت ہے۔ پس جب ایک وصی نے تنہا تصرف کیا تو اس نے دوسرے کا حق بھی حاصل کر لیا لہذا صحیح نہ ہوا۔

اس مسئلے میں اس قرض کو اصل اور قانون کی حیثیت حاصل ہے جو دونوں پر واجب ہوا ور جو دونوں کے لیے ہو (مثلاً و کا قرضہ ب اور ج کے ذمہ ہو۔ دونوں میں سے ایک نے ادا کر دیا تو صحیح ہے لیکن اگر ا کے ذمہ ب اور ج کا قرض ہو اور ب سارا قرض وصول کر لے تو یہ وصولی ج کی طرف سے شمار نہ ہوگی۔ اسی طرح ایک وصی کا دوسرے وصی کے حق میں تصرف کرنا صحیح نہ ہوگا اور مسئلہ نکاح میں ایک بھائی کا حق واجب کو ادا کر دینا دوسرے کی طرف سے بھی صحیح ہوگا۔)

بخلاف ان چند اشیاء کے جن میں ایک وصی کا تصرف صحیح ہو سکتا ہے ان کا استثناء ضرورت اور مجبوری کے مد نظر کیا گیا۔ ولایت کے پیش ایسا نہیں کیا گیا۔ اور ضرورت و مجبوری کے مواقع ہمیشہ عام اصولوں سے مستثنیٰ ہوا کرتے ہیں۔ اور یہ چند چیزیں وہی ہیں جن کو قدوری میں مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے یا وہ اشیاء جو ان کی طرح ہیں۔

پس فرمایا۔ مگر کفن میت کی خریداری اور تجہیز و تدفین کی اشیاء خریدنے میں۔ کیونکہ اگر دوسرے وصی کی غیر موجودگی کی وجہ سے تاخیر کی جائے لاش کے خراب ہونے کا خدشہ ہے۔ اسی بناء پر ایسے حالات

میں ان اشیاء کا اختیار پڑوسیوں کو بھی حاصل ہوتا ہے (اگرچہ انھیں ولایت نہیں ہوتی)

چھوٹے بچوں کا کھانا اور ان کا کپڑا۔ کیونکہ اگر دوسرے وصی کا انتظار کیا جائے تو ان کے بھوک سے مرجانے کا خدشہ ہے اور ننگا رہنے کی وجہ سے بھی ہلاکت کا اندیشہ ہے (خصوصاً جب سخت سردی کا موسم ہو)

یعینہٖ مال ودیعت واپس کرنے، مغصوب چیز کے لوٹانے۔ شراء فاسد سے خرید کردہ چیز کو رد کرنے، اموال کی حفاظت کرنے اور قرضوں کی ادائیگی کے سلسلے میں ایک وصی بھی تصرف کر سکتا ہے۔ کیونکہ یا مور باب ولایت سے نہیں۔ چنانچہ مغصوب کا مالک اور قرضے کا قرضخواہ جب اپنے حق کی جنس پر قابو پائے ایسا کرنے کا مالک ہوگا (یعنی مغصوب منہ اپنی غصب کردہ چیز واپس لے سکتا ہے اور قرضخواہ اپنے قرض کی وصولی کر سکتا ہے خواہ دوسرا وصی موجود نہ ہو) اور کسی کے مال کی حفاظت کا اختیار ہر اس شخص کو ہوتا ہے جس کے ہاتھ لگے۔ تو یہ فعل از قسم امانت ہے (از قسم ولایت نہیں)

دوسری بات یہ ہے کہ اس قسم کی چیزوں میں دوسرے کی رائے لینے کی ضرورت نہیں ہوتی (ایک وصی ہی ایسا کر سکتا ہے) کسی معین وصیت کے نافذ کرنے اور کسی مخصوص غلام کے آزاد کرنے میں بھی ایک وصی کو اختیار ہوتا ہے کیونکہ اس میں دوسرے کے مشورے کی

ضرورت نہیں ہوتی۔

اور میت کے اس حق کے لیے خصومت کرنا جو کسی دوسرے پر ہے (اس میں بھی صرف ایک وصی خصومت کر سکتا ہے) کیونکہ بعض اوقات دونوں کا اکٹھا ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ اسی بناء پر دو وکیلوں میں سے ایک کو خصومت کا اختیار ہوتا ہے (یعنی اگر ایک مقدمے کے دو وکیل ہوں تو یہ ضروری نہیں کہ دونوں مل کر مقدمے کی پیروی کریں بلکہ صرف ایک وکیل بھی کر سکتا ہے۔)

کوئی ہدیہ قبول کرنے میں (یعنی اگر کسی صغیر وارث کو کوئی شخص ہدیہ دے تو ایک وصی ہی قبول کر سکتا ہے دوسرے کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ تاخیر کرنے میں ہدیے کے ضائع ہونے کا خدشہ ہے اور ہبہ کے قبول کرنے کا اختیار تو ماں کو بھی ہے اور اس بچے کو بھی جو اس کی تربیت میں ہے۔ لہٰذا قبول ہدیہ باب ولایت سے نہ ہوگا۔

اور ترکہ میں سے ان چیزوں کا فروخت کرنا جن کے ضیاع اور تلف کا اندیشہ ہو۔ (مثلاً پھل یا انڈے) کیونکہ ایسی اشیاء کے فروخت کرنے کی ضرورت مخفی نہیں۔

اور متفرق اموال کا جمع کرنا (کیونکہ (اگر دوسرے وصی کے آنے کا انتظار کیا جائے تو) تاخیر کرنے میں گم اور ضائع ہونے کا خدشہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس قسم کے تصرف کا اختیار ہر اس شخص کو ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں اس قسم کا مال آ جائے لہٰذا یہ باب ولایت سے نہ ہوگا۔

الجامع الصغیر میں مذکور ہے۔ موصی کے دو وصیوں میں سے صرف ایک کو یہ اختیار نہیں کہ ترکہ میں سے کوئی چیز فروخت کرے یا میت کے مال کی وصولی کے لیے تقاضا کرے۔ تقاضا سے مراد وصولی ہے (یعنی وہ تنہا وصولی نہیں کرسکتا جب کہ دوسرا وصی موجود نہ ہو۔ عرف فقہاء میں تقاضا سے یہی مراد ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موصی وصولی کے سلسلے میں ان دونوں کی مجموعی امانت پر راضی ہوا تھا۔ (اسی لیے دونوں کو وصی مقرر کیا۔ صرف ایک کی امانت پر تنہا راضی نہ ہوا تھا)

دوسری بات یہ ہے کہ تقاضا معنوی لحاظ سے مبادلہ کے مترادف ہے (خواہ نقد قرض کی ادائیگی ہو یا کسی چیز کی قیمت ہو) خصوصاً جب کہ جنس کا اختلاف ہو۔ جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے تو یہ چیز ولایت کے باب سے ہوگی۔

اگر موصی نے ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ اور مستقل طور پر وصی بنایا تو ابو القاسم الصفار اور فقیہ ابو اللیث کے نزدیک ہر ایک کو مستقل طور پر تصرف کرنے کا اختیار ہوگا۔ جیسا کہ دو وکیل جب کہ دونوں کو انفرادی اور مستقل طور پر وکیل مقرر کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب موصی نے ہر وصی کو انفرادی طور پر وصی مقرر کیا تو وہ ہر ایک کی رائے پر راضی ہوا۔

ابو بکر الاسکاف فرماتے ہیں کہ طرفین کا امام ابو یوسف سے اختلاف دونوں صورتوں میں یکساں ہے (یعنی موصی دونوں کو اجتماعی طور پر وصی

بنائے یا انفرادی طور پر) کیونکہ وصیت کا وجوب موصی کی موت پر ہوتا ہے۔ بخلاف دو وکیلوں کے (یعنی جن کو اپنی زندگی میں اس نے وکیل بنایا) کیونکہ وکالت آگے پیچھے واقع ہوتی ہے (پہلے جسے وکیل بنایا وہ وکیل بنا پھر دوسرا)۔

اگر ان دو وصیوں سے ایک فوت ہو جائے تو قاضی اس کی جگہ ایک اور وصی مقرر کرے (بالاتفاق) طرفین کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ جو ایک وصی باقی رہ گیا ہے وہ اکیلا ہونے کی وجہ سے تصرف سے قاصر ہے۔ لہٰذا قاضی اس کے ساتھ ایک اور وصی مقرر کرے گا تاکہ ایک وصی کے عجز کی صورت میں میت کے مصالح کی رعایت ہو سکے۔

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اگرچہ تنہا وصی کو تصرف کا اختیار ہوتا ہے اس لیے ان میں جو زندہ ہے وہ تصرف کی قدرت رکھتا ہے لیکن موصی کا مقصد یہ تھا کہ اس کے حقوق میں دو تصرف کرنے والے اس کے نائب ہوں اور مرنے والے وصی کی جگہ دوسرا وصی مقرر کرکے موصی کے مقصد کا تحقق ممکن ہے۔

اگر ان میں سے ایک وصی نے مرتے وقت زندہ وصی کو ہی وصی مقرر کر دیا تو ظاہر الروایۃ کے مطابق زندہ وصی کو تصرفات کا اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ اگر وہ مرتے وقت کسی اور شخص کو وصی بنا جاتا (تو وہ پہلے وصی کے ساتھ تصرف کرنے کا مالک ہوتا) اور اس صورت میں قاضی کو ضرورت نہیں رہتی کہ وہ کسی اور شخص کو وصی مقرر کرے (کیونکہ

مرنے والے وصی نے خود ہی دوسرا وصی مقرر کر دیا) اس لیے کہ موصی کے
نائب کی رائے کی وجہ سے میت موصی کی رائے حکماً موجود ہے (یعنی وصی
کی رائے گویا موصی کی رائے ہے)

امام ابو حنیفہؒ سے منقول ہے کہ صرف ایک زندہ وصی کو اکیلے طور
پر تصرف کا اختیار نہ ہوگا کیونکہ موصی اس اکیلے کے تصرف پر راضی
نہیں ہوا تھا۔ بخلاف اس کے اگر وصی مرتے وقت دوسرے کو وصی مقرر
کر دے تو درست ہے اس لیے کہ زندہ رہنے والے وصی کا تصرف
دوسرے نئے مقرر کردہ وصی کی رائے کے ساتھ نافذ ہوتا ہے کیونکہ خود موصی
بھی دو آدمیوں کی رائے پر راضی تھا۔

جب وصی مر جائے لیکن کسی دوسرے کو اپنا وصی مقرر کر جائے تو یہ
دوسرا آدمی اس وصی اور میت اول دونوں کے ترکے میں وصی ہوگا۔
یہ احناف کی رائے ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہ نیا وصی میت اول
کے ترکہ میں وصی نہ ہوگا۔ اس توکیل پر قیاس کرتے ہوئے جو بحالت
زندگی ہو (مثلاً ا نے ب کو وکیل بنایا اور ب نے ج کو تو ج ب کا وکیل
ہوگا ا کا نہ ہوگا) اور علت جامع دونوں میں یہ ہے (دونوں سے مراد
وصایت اور توکیل ہے) کہ موصی صرف اس وصی کی رائے پر تو راضی
تھا کسی غیر کی رائے پر راضی نہ تھا۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ وصی ایسی وصایت کی بنا پر تصرف کرتا
ہے جو اس کی طرف میت کی طرف سے بطریق خلافت منتقل ہوتی ہے

لہٰذا دوسرے کو وصی بنانا اس کے دائرۂ اختیار میں ہوگا۔ (جیسے باپ کی وفات کے بعد دادا کو اختیار ہوتا ہے) کیا آپ کو معلوم نہیں کہ موصی کے لیے جو ولایت ثابت تھی وہ مال کے سلسلے میں وصی کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور دادا کی طرف نفس و جان میں منتقل ہوتی ہے۔

دادا کی طرف جو ولایت منتقل ہوتی ہے اس میں دادا یتیم بچوں کے باپ کا قائم مقام ہوتا ہے (یعنی دادا کو بچوں کے باپ جیسے حقوق حاصل ہو جاتے ہیں) اسی طرح وصی کو بھی مال میں وصی وغیرہ مقرر کرنے کے حقوق حاصل ہو جاتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایصاء نام ہے کسی دوسرے کو اس چیز میں جس کی ولایت موصی کو حاصل ہے اپنا قائم مقام بنا دینا اور وصی کو موت کے وقت دونوں ترکوں میں ولایت حاصل تھی (یعنی اپنے اور موصی کے ترکے میں) تو نیا مقرر کردہ وصی بھی ان دونوں ترکوں میں اس کا قائم مقام ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ موصی نے اپنی کوتاہی کے تدارک کے سلسلے میں جب وصی سے مدد طلب کی اور موصی یہ بھی جانتا تھا۔ ممکن ہے کہ میرے مقصود کی تکمیل سے پہلے ہی وصی کو موت آ جائے اس مقصد سے مراد موصی کی کوتاہیوں اور تقصیرات کا تدارک ہے۔ تو گویا موصی کی رضامندی اس بات میں بھی پائی گئی کہ مقصد کی تکمیل کے لیے یہ کسی دوسرے کو وصی بنا دے۔ بخلاف وکیل مقرر کرنے کے کیونکہ مؤکل جب وکیل مقرر کرتا ہے

تو خود بھی زندہ ہوتا ہے اور اپنے مقصد کو خود بھی پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتا ہے۔ لہٰذا وہ اس بات پر راضی نہیں ہوتا کہ کسی دوسرے کو وکیل بنائے اور نہ اس بات پر کہ وہ کسی دوسرے کو وصی بنائے۔

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے فرمایا۔ اور وصی کا وارثوں کی طرف سے نائب بن کر ان کی طرف سے موصٰی لہٗ سے ترکے کی تقسیم کرانا جائز ہے لیکن وصی کا موصٰی لہٗ کی طرف سے نائب بن کر ورثاء سے تقسیم کرانا باطل ہے۔ کیونکہ وارث میت کا خلیفہ اور نائب ہوتا ہے حتیٰ کہ اگر کوئی چیز موصی نے بشرط الخیار خریدی ہو تو عیب پائے جانے پر وارث اسے واپس کر سکتا ہے۔ یا اگر موصی نے بشرط الخیار کوئی چیز فروخت کی ہو تو مشتری عیب پائے جانے پر وارث کو واپس کر سکتا ہے اور مورث کی خرید سے وارث مغرور (جسے دھوکا دیا گیا ہو) ہو سکتا ہے (مثلاً مورث نے ایسی باندی خریدی جس کی عیوب سے برات نہیں کی گئی تھی۔ وہ باندی وارث کے حصے میں آئی۔ اس باندی سے وارث کی اولاد ہوئی۔ پھر ایک شخص نے اس باندی پر ملکیت کا دعویٰ ثابت کر دیا اور بتایا کہ بائع نے تو میری باندی فروخت کی ہے۔ تو باندی اصل مالک کو مل جائے گی لیکن اس کی اولاد نہ دی جائے گی بلکہ اولاد اپنی قیمت کے لحاظ سے آزاد ہوگی۔ کیونکہ وارث اپنے مورث کی وجہ سے فریب خوردہ ہے۔ جیسے کہ مورث خود فریب خوردہ تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ وارث اپنے مورث کے قائم مقام ہے۔

اور وصی بھی میت کا خلیفہ و نائب ہوتا ہے۔ تو وصی وارث کی طرف سے خصم ہوگا (یعنی جس طرح وارث کو مدعا علیہ بنایا جا سکتا ہے اسی طرح وصی کو بھی بنایا جا سکتا ہے) جب وارث موجود نہ ہو تو وصی کی تقسیم وارث پر صحیح طور پر نافذ ہوگی۔ حتیٰ کہ تقسیم کے بعد اگر وارث آ گیا درآنحالیکہ وارث کا وہ حصہ جو وصی کے قبضہ میں تھا تلف ہو گیا تو وارث کو یہ حق نہ ہوگا کہ موصیٰ لہٗ کے حاصل کردہ حصہ میں شارکت کرے۔

موصیٰ لہٗ کی میت کی طرف سے پورے طور پر خلیفہ اور نائب نہیں ہوتا کیونکہ موصیٰ لہٗ تہائی ترکے کا ایک نئے سبب (یعنی وصیت) کی بنا پر مالک بنا ہے۔ اسی لیے موصیٰ لہٗ موصی کی خرید کردہ چیز عیب کی بنا پر واپس نہیں کر سکتا۔ اور نہ مشتری عیب کی بنا پر اس چیز کو موصیٰ لہٗ کو واپس کر سکتا ہے جو موصی نے فروخت کی تھی۔ اور نہ موصیٰ لہٗ موصی کی خرید کی وجہ سے فریب خوردہ ہو سکتا ہے۔ پس وصی موصیٰ لہٗ کے غائب ہونے کی صورت میں اس کا نائب نہیں بن سکتا حتیٰ کہ ترکے کی وہ مقدار جو وصی نے موصیٰ لہٗ کے لیے علیحدہ کر کے اپنے پاس رکھ لی ہے اگر ضائع ہو جائے تو باقی ماندہ ترکہ سے موصیٰ لہٗ تہائی کا حق دار ہوگا۔ کیونکہ وصی کی تقسیم موصیٰ لہٗ پر نافذ نہیں ہوئی۔ البتہ اتنی بات ہے کہ مذکورہ تلف کی صورت میں وصی ضامن نہ ہوگا کیونکہ اس تہائی میں وہ امین کی حیثیت سے تھا۔ اسے ترکہ کی حفاظت کی

ولایت حاصل ہے۔ جیسا کہ تقسیم سے پہلے کچھ ترکہ تلف ہو جائے تو موصی لہٗ کو باقی ترکہ سے ثلث ملے گا۔ کیونکہ موصی لہٗ وارث کے ساتھ شریک ہوتا ہے پس مالِ مشترک سے جو کچھ ضائع ہو گا وہ بحالت شرکت ضائع ہو گا اور جو مال باقی بچا ہے وہ شرکت پر باقی ہو گا۔

مسئلہ: فرمایا اگر وصی نے ورثاء کے ساتھ تقسیم کر کے موصی لہٗ کا حصہ لے لیا اور یہ حصہ ضائع ہو گیا تو موصی لہٗ باقی مال میں ثلث کے لیے رجوع کرے گا۔ اس کی دلیل ہم ابھی بیان کر چکے ہیں۔

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا کہ اگر موصی نے وصی کو حج کرانے کی وصیت کی۔ اس کے وارثوں نے ترکہ کی تقسیم کر لی۔ تقسیم کے بعد باقی ماندہ مقدار جو وصی کے پاس تھی ضائع ہو گئی تو باقی ماندہ مال کے ثلث سے موصی کی طرف سے حج کرایا جائے گا۔ اسی طرح اگر وصی نے وہ مقدار کسی شخص کو دے دی کہ موصی کی طرف سے حج کرائے۔ لیکن وہ مال اس شخص کے ہاں ضائع ہو گیا تو باقی ماندہ ترکہ کے ثلث سے حج کے لیے لیا جائے گا۔

امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ حج کے لیے علیحدہ کیا ہوا مال اگر ثلث کا احاطہ کرنے والا ہے (یعنی تہائی کے برابر ہے) تو وصی مزید کسی مقدار کے لیے رجوع نہ کرے گا۔ اور اگر ثلث کا احاطہ کرنے والا نہ ہو تو ثلث کی تکمیل تک رجوع کر سکتا ہے۔

امام محمدؒ نے فرمایا کہ اب وصی باقی مال سے رجوع نہیں کر سکتا۔

کیونکہ تقسیم تو موصی کا حق ہے۔ اگر موصی نے بذاتِ خود کچھ مال علیحدہ کر لیا ہوتا کہ اس سے حج کرایا جائے اور وہ مال تلف ہو جائے تو کچھ لازم نہ ہوگا اور وصیت باطل ہو جائے گی۔ لہٰذا جب اس کے قائم مقام وصی نے علیحدہ کیا اور مال تلف ہو گیا تو بھی کچھ واجب نہ ہوگا۔

امام ابویوسفؒ کی دلیل یہ ہے کہ وصیت کا محل صرف ثلثِ ترکہ ہے۔ لہٰذا جب تک وصیت کا محل یعنی تہائی باقی ہے تو وصیت کا نفاذ بھی واجب ہوگا۔ لیکن اگر ثلث سے کچھ باقی نہ رہا تو وصیت بھی محل کے فوت ہو جانے کی بناء پر باطل ہو جائے گی۔

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ تقسیم بذاتہ مقصود نہیں ہوتی بلکہ تقسیم کا معاملہ صرف اس مقصد کے لیے ہوتا ہے جو اس سے مقصود ہے اور یہ مقصود حج کی ادائیگی ہے تو اس مقصد کے حصول کے بغیر تقسیم قابلِ اعتبار نہ ہوگی۔ جیسے کہ تقسیم سے پہلے اس قدر (یعنی تہائی) مال ضائع ہو جائے تو بالاتفاق باقی ماندہ مال کی تہائی سے حج کرایا جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ تقسیم کا مکمل ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ اس تہائی مال کو اس طرح سپرد کیا جائے جس طرح موصی نے وصیت کی ہے۔ کیونکہ اس مال کا قبضہ کرنے والا کوئی شخص نہیں (بلکہ اس مال کا مصرف تو عبادتِ حج ہے) لیکن جب اس کو موصی کی وصیت اور مقصد کے مطابق خرچ نہ کیا گیا تو گویا تقسیم ہی مکمل نہ ہوئی اور ایسے ہوگا

کہ گویا تقسیم سے پہلے ہی یہ مال تلف ہوگیا تھا۔

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا۔ اگر ایک شخص نے ہزار درہم کی تہائی کی وصیت کی۔ ورثاء نے ہزار درہم قاضی کے حوالے کر دیے قاضی نے ان دراہم کو تقسیم کر دیا حالانکہ موصٰی لہٗ غائب تھا تو قاضی کی تقسیم جائز ہوگی۔ کیونکہ وصیت صحیح ہے۔ اسی لیے اگر موصٰی لہٗ قبول کرنے سے پہلے مرجائے تو وصیت میراث میں تبدیل ہو کر ورثاء کے لیے ہو جاتی ہے اور قاضی مسلمانوں کے امور کا نگران ہوتا ہے خصوصاً ان کے لیے جو مرگئے ہیں یا جو غائب ہیں۔ اور رعایت ونگہداشت کا تقاضا یہی ہے کہ غائب کا حصہ الگ کر لیا جائے اور قاضی اسے اپنے قبضہ میں محفوظ کر لے۔ اور ایسا کرنا یعنی تقسیم کر کے اپنے پاس رکھ لینا نافذ و صحیح ہوگا۔ حتّٰی کہ اگر غائب شخص حاضر ہوگیا حالانکہ مال مقبوض تلف ہو چکا ہے تو موصٰی لہٗ کو ورثاء سے مطالبہ کرنے کا کوئی جواز نہ ہوگا۔

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا۔ اگر وصی نے ترکہ میں سے ایک غلام قرضخواہوں کی موجودگی کے علاوہ فروخت کر دیا تو جائز ہوگا کیونکہ وصی موصی کے قائم مقام ہوتا ہے۔ اگر وصی خود بحالت زندگی اسے فروخت کرتا تو قرضخواہوں کی غیر موجودگی میں اس کی بیع صحیح ہوتی اگرچہ وہ مرض موت کی حالت میں ہی فروخت کرتا۔ پس اسی طرح اگر اس کے خلیفہ و نائب نے بیع کی تو وہ بھی صحیح ہوگی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قرضخواہوں کا حق غلام کی مالیت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی صورت سے نہیں رکھتے۔ اور بیع سے غلام کی مالیت فوت نہیں ہوتی۔ اگرچہ اس کی ذات مالک کے ہاں باقی نہیں رہتی لیکن ذات کا قائم مقام باقی ہوتا ہے اور وہ قیمت ہے۔ بخلاف اس غلام کے جو مدیون ہو۔ (اس صورت میں قرض خواہوں کی غیر موجودگی میں آقا اور وصی کو ایسے غلام کی فروخت کا حق نہیں ہوتا) کیونکہ مدیون غلام کے بارے میں قرضخواہوں کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ غلام سے کمائی کرائیں۔ لیکن مذکورہ صورت اس کے خلاف ہے (یعنی اس صورت میں قرضخواہ اس غلام سے مزدوری نہیں کرا سکتے)

مسئلہ: امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا۔ ایک شخص نے وصیت کی کہ اس کا غلام فروخت کر دیا جائے اور اس کی قیمت مساکین پر صدقہ کر دی جائے۔ وصی نے اسے وصیت کے مطابق بیچ دیا اور قیمت وصول کر لی۔ لیکن اس کے ہاں ضائع ہو گئی۔ اور غلام پر کسی اور شخص کا استحقاق ثابت ہو گیا تو وصی مشتری کے لیے ثمن کی ادائیگی کا ضامن ہو گا۔ کیونکہ وصی ہی عقد بیع کر رہا ہے لہٰذا عقد کی ذمہ داری اسی پر ہو گی اور مشتری کو ثمن کی ادائیگی عقد کی ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری ہے کیونکہ مشتری نے صرف اسی صورت میں ثمن خرچ کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا تھا کہ مبیع یعنی غلام اس کے لیے صحیح وسالم رہے لیکن بوجہ استحقاق غلام تو سالم نہ رہا اس لیے ثابت ہوا کہ بائع یعنی

وصی نے دوسرے کے مال پر اس کی رضامندی کے بغیر قبضہ کر لیا۔ لہٰذا اس پر واجب ہوگا کہ وہ اس مال کو واپس کر دے اور وہ اس ادا کردہ ضمان کے سلسلے میں میت کے ترکہ سے رجوع کرے۔ کیونکہ وصی نے جو عمل کیا ہے وہ میت کے لیے ہی کیا ہے تو وہ میت کے ترکہ کی طرف رجوع کرے گا۔ جیسا کہ وکیل ادا کردہ ضمان میں مؤکل سے رجوع کرتا ہے۔

پہلے پہل امام ابو حنیفہ رح فرمایا کرتے تھے کہ وصی کو میت کے ترکہ میں رجوع کرنے کا حق نہیں۔ کیونکہ وہ اپنے قبضہ کی بناء پر ضامن بنتا ہے پھر امام نے اس قول سے رجوع فرما کر اس قول کو اختیار کیا جو ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔

وصی کو یہ ضمان واپس لینے کا اختیار موصی کے پورے ترکہ سے ہے یہی ظاہر الروایت ہے۔ امام محمد رح سے نوادر میں منقول ہے کہ وصی ثلث ترکہ کی مقدار تک رجوع کر سکتا ہے کیونکہ رجوع بحکم وصیت ہے۔ اس لیے کہ اس کا حکم بھی وصیت جیسا ہوگا اور وصیت کا محل صرف ترکہ کی تہائی ہے۔

ظاہر الروایۃ کی وجہ یہ ہے کہ وصی کو یہ اختیار رجوع دھوکا کھانے کے سبب سے ہے اور یہ دراصل میت پر ایک قرض ہے اور قرض کی ادائیگی پورے ترکہ سے کی جاتی ہے بخلاف قاضی یا امین کے کہ اگر ان میں سے کوئی بیع کرے تو ان پر بیع کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کیونکہ اگر ان پر اس قسم کی ذمہ داری عائد کر دی جائے تو منصب قضا کا تعطل لازم آئے گا۔

اس لیے کہ قاضی ایسی امانت و ذمہ داری سے گریز کرے گا کیونکہ اسے جرمانے اور تاوان کا اندیشہ ہوگا (لوگ منصب قضاء سے دور رہنے کو ترجیح دیں گے) اور عوام کے مصالح معطل ہوکر رہ جائیں گے۔ اور قاضی کا امین تو صرف قاضی کا سفیر اور نمائندہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ قاصد صرف سفیر کی حیثیت رکھتا ہے لیکن وصی کی حیثیت ایسی نہیں ہوتی بلکہ وہ تو بمنزلہ وکیل ہوتا ہے۔ کتاب القضاء میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

اگر میت کا ترکہ تلف ہوگیا یا اس میں اتنی گنجائش نہ رہی کہ تاوان کی ادائیگی کی جا سکے تو وصی کو کسی چیز کے رجوع کا حق حاصل نہ ہوگا جیسا کہ میت پر کوئی دوسرا ایسا قرضہ ہوتا جو ترکہ کو محیط ہوتا تو بھی وصی کو رجوع کا اختیار نہ ہوتا۔

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا۔ اگر وصی نے میراث کو تقسیم کیا اور ان ورثاء میں سے ایک نابالغ وارث کے حصے میں ایک غلام آیا وصی نے اس غلام کو فروخت کر دیا اور قیمت وصول کر لی۔ اور یہ قیمت وصی کے ہاں ضائع ہوگئی۔ دریں اثناء غلام پر کسی دوسرے کا حق ثابت ہوگیا اور وصی نے ضمان ادا کر دیا تو وہ صغیر کے مال میں رجوع کرے گا۔ کیونکہ وصی صغیر کے لیے ہی عمل کرنے والا ہے پھر یہ صغیر اپنا حصہ دوسرے ورثاء سے واپس لے گا۔ کیونکہ اس کے حصے میں جو چیز آئی تھی اس میں استحقاق ثابت ہونے کی بناء پر تقسیم باطل ہوگئی۔

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا اگر یتیم کے وصی نے مالِ یتیم کا حوالہ کسی شخص پر قبول کیا۔ اگر اس صورت میں یتیم کے لیے بہتری ہے تو حوالہ جائز ہوگا۔ یعنی وہ شخص جس پر حوالہ کیا گیا ہے اصل مدیون کی نسبت زائد مال دار ہو کیونکہ وصی کی ولایت شفقت و نظر کی ولایت ہے۔ اگر اصل مدیون زائد مال دار ہے تو پھر حوالہ جائز نہ ہوگا کہ ایسی بعض صورتوں میں یتیم کا مال ضائع ہو جاتا ہے (اس کی توضیح یہ ہے کہ ا نے صغیر اولاد کے لیے ب کو وصی مقرر کیا۔ صغیر کا دو سو روپیہ ج پر قرض ہے۔ ج نے اس قرض کا د پر حوالہ کیا اور وصی نے یہ حوالہ قبول کر لیا۔ اگر د بہ نسبت ج کے خوشحال ہو تو حوالہ جائز ہے اور اگر ج د سے زیادہ خوش حال ہے تو حوالہ قبول کرنے میں بچے کے مال کا نقصان ہے کیونکہ د بوجہ غربت کے دیر سے ادائیگی کرے گا اور رقم بروقت بچے کے کام نہ آئے گی)

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا وصی کی فروخت یا خرید صرف اسی صورت میں جائز ہوگی جب وہ ایسے داموں پر بیع و شراء کرے جو لوگوں کے نزدیک قابلِ برداشت ہوں (صریح خسارے کی صورت میں بیع و شراء جائز نہ ہوگی) کیونکہ غبن فاحش کی صورت میں بہتری کی نگہداشت نہیں پائی جاتی۔ بخلاف قلیل خسارے کے کیونکہ اس سے احتراز کرنا عموماً ممکن نہیں ہوتا (اس لیے کہ بازار کے بھاؤ میں اتار چڑھاؤ کا سلسلہ جاری رہتا ہے)۔

اگر قلیل خسارے کو بھی قابلِ اعتبار سمجھا جائے تو وصیت کا دروازہ ہی مسدود ہو جائے گا۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ماذون بچے۔ ماذون غلام اور مکاتب کی بیع و شراء غبنِ فاحش کے ساتھ جائز ہے کیونکہ یہ لوگ مالکانہ تصرف کرتے ہیں اور اجازت دینا ممانعت دور کرنے کا نام ہے۔ بخلاف وصی کے کہ اس کا تصرف مالکانہ حیثیت سے نہیں ہوتا بلکہ نائب ہونے کی حیثیت سے ہوتا ہے جو شریعت کی طرف سے اس کو نگہداشت کی شرط کے ساتھ حاصل ہے۔ لہٰذا وصی کا تصرف مواضع نظر و نگہداشت کے ساتھ مشروط ہوگا۔

صاحبینؒ کے نزدیک مذکورہ لوگوں کو غبنِ فاحش کے ساتھ خرید و فروخت کا حق حاصل نہیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی طرف سے غبنِ فاحش بطور تبرّع ہوتا ہے اور اس میں کوئی مجبوری نہیں ہوتی۔ اور یہ لوگ تبرّع کرنے کی اہلیت سے محروم ہوتے ہیں۔

جب کسی وصی پر خرید کا بیع نامہ تحریر کیا جائے تو وصیت نامہ الگ لکھا جائے گا اور بیع نامہ علیحدہ تحریر کیا جائے گا۔ کیونکہ اس میں زائد احتیاط ہے (اس لیے کہ ہر امر کے لیے علیحدہ گواہی کی ضرورت ہوگی اور اس سے دونوں تحریروں میں استحکام پیدا ہوگا)

اگر دونوں کی اکٹھی تحریر لکھی گئی تو ممکن ہے کہ گواہ اپنی گواہی تحریر کے آخر میں مجمل طور پر تفصیل کے بغیر لکھ دے تو یہ چیز گواہ

کے لیے جھوٹ پر آمادہ کرنے کا باعث ہو گی اگر شاید اس سے ایک
امر کی گواہی تحریر کی ہو اور رد موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی گواہی
معلق امور کو قرار دے

بعض حضرات نے کہا کہ تحریر یوں لکھی جائے کہ فلاں ابن فلاں
سے خریدا اور یوں نہ لکھا جائے کہ فلاں سے خریدا جو فلاں کا وصی ہے
بدلیل مذکورہ بالا۔ بعض حضرات نے کہا کہ فلاں وصی فلاں لکھنے میں
بھی کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ وصایت ایسی چیز ہے جس کا ظہور ہر ایک
کے علم میں ہوتا ہے۔

مسئلہ: امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا۔ وصی کو بالغ غائب
وارث کی ہر چیز کے فروخت کا اختیار ہے سوائے غیر منقولہ جائداد
یعنی زمین کے۔ کیونکہ باپ کو بھی اپنے بالغ غائب بیٹے کی زمین کے
علاوہ دوسری چیزوں کی فروخت کا اختیار ہوتا ہے لہٰذا اسی طرح
کا اختیار وصی کو بھی حاصل ہوگا۔

قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ وصی کو زمین کے علاوہ دوسری
چیزوں کی فروخت کا اختیار بھی نہ ہو جس طرح باپ کو بالغ بیٹے
کی اشیاء کی فروخت کا حق نہیں ہوتا۔ مگر ہم نے استحسان کے مدنظر
ایسی فروخت کو جائز قرار دیا۔ کیونکہ زمین کے علاوہ دوسرے اموال
کی فروخت میں حفاظت کا پہلو مدنظر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ بعض
اموال میں جلد ہی خرابی واقع ہو جاتی ہے۔ اور اموال کی حفاظت کی

بجائے قیمت کی حفاظت زیادہ آسان ہوتی ہے اور وصی کو حفاظت کی ملکیت حاصل ہے۔ لیکن جہاں تک زمین کا تعلق ہے وہ بنفسہٖ محفوظ ہوتی ہے (لہٰذا اس کی فروخت کی کوئی مجبوری نہیں ہوتی)

مسئلہ:۔ فرمایا کہ وصی کو مال ترکہ میں تجارت کی اجازت نہیں ہوتی کیونکہ جو چیز وصی کے سپرد کی گئی ہے وہ مال کی حفاظت ہے نہ کہ اس میں تجارت کرنا۔

امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ نے فرمایا کہ باپ کے وصی کو بالغ غائب کے مال میں جو اختیارات حاصل ہیں وہی اختیارات بھائی کے وصی کو اس کے زندہ بڑے یا چھوٹے بھائی کے مال میں حاصل ہوں گے (یعنی جس طرح باپ کا وصی زمین کے علاوہ دیگر اشیاء فروخت کر سکتا ہے اسی طرح بھائی کا وصی بھی کر سکتا ہے)

ماں اور چچا کے وصی کا بھی یہی حکم ہے۔ ان کے ترکہ کے بارے میں وصی کا بھی یہی حکم ہوگا۔ کیونکہ ان کا وصی ان کے قائم مقام ہوتا ہے اور یہ لوگ ان چیزوں کی ملکیت رکھتے تھے جو از قبیل حفاظت ہوں۔ اس لیے ان کے وصی کے بھی یہی اختیار ہوں گے۔

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا کہ دادا کی بہ نسبت وصی صغیر کے مال میں زیادہ حق دار ہوتا ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ دادا زیادہ حق دار ہے۔ کیونکہ شریعت نے دادا کو باپ کی عدم موجودگی میں باپ کے قائم مقام قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ دادا اپنے پوتے

کی کل میراث لے سکتا ہے۔ لہٰذا دادا کو وصی پہ فوقیت حاصل ہوگی۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ وصایت کی بنا پر باپ کی ولایت وصی کی طرف منتقل ہوجاتی ہے تو وصی کی صورت میں معنوی طور پر باپ کی ملکیت قائم و ثابت ہوگی۔ پس وصی کو دادا پر مقدم کیا جائے گا۔ جیسے خود باپ کو دادا پر مقدم کیا جاتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ باپ کا وصی کو اختیار کرنا جبکہ اسے دادا کی موجودگی کا علم ہے اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ موصی کے نزدیک وصی کا تصرف اپنے بچوں کے حق میں اپنے باپ کی بہ نسبت زائد بہتر اور نگہداشت کی رعایت میں بڑھ کر ہے۔

اگر صغیر کا باپ وصیت نہ کرے تو پھر دادا باپ کا قائم مقام ہوگا کیوں کہ دادا ہی پوتے کے حق میں سب سے قریب تر ہے اور اس کی شفقت بھی دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ حتیٰ کہ اسے صغیر کے نکاح کا اختیار ہوتا ہے اور وصی کو یہ اختیار نہیں ہوتا۔ البتہ اتنی بات ہے کہ باپ کا وصی تصرفات میں دادا پر فوقیت رکھتا ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

فصل فی الشہادۃ

گواہی کے بیان میں فصل

مسئلہ:- امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا جب دو وصی گواہی دیں کہ میت یعنی موصی نے فلاں تیسرے شخص کو بھی ان دونوں کے ساتھ وصی مقرر کیا تھا تو ان کی شہادت باطل قرار دی جائے گی کیونکہ اس شہادت کی وجہ سے ان پر الزام عائد ہو سکتا ہے کہ اپنے لیے ایک مددگار ثابت کرنے کے لیے ایک اور شخص کو وصایت میں شامل کر رہے ہیں۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں ہاں اگر مشہود لہٗ وصایت کا دعویٰ کرے تو ان کی شہادت کو تسلیم کیا جا سکتا ہے اور یہ قبولیتِ شہادت استحسان کے تحت ہو گی۔ حالانکہ قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ پہلی صورت کی طرح اس اس صورت میں بھی شہادت ناقابلِ قبول ہو کیونکہ اس صورت میں بھی ہمارا بیان کردہ الزام عائد ہو سکتا ہے۔

استحسان کی وجہ یہ ہے کہ قاضی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ابتداءً ہی وصی مقرر کر دے یا ایک تیسرے شخص کو ان کے ساتھ ملا دے اپنی منشا کے ساتھ۔ ان سے شہادت لیے بغیر۔ البتہ ان کی شہادت سے قاضی تعیین کرنے کی مشقت سے بچ جائے گا۔ جہاں تک وصایت کا تعلق ہے وہ قاضی کے وصی مقرر کرنے سے ثابت ہو جاتی ہے۔

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے فرمایا۔ دو بیٹوں کا بھی یہی حکم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دو بیٹے اس امر کی گواہی دیں کہ موصی نے فلاں شخص کو وصی مقرر کیا ہے حالانکہ وہ وصایت سے انکار کر رہا ہے (تو بیٹوں کی شہادت باطل ہوگی) کیونکہ ان پر یہ الزام لگ سکتا ہے کہ وہ خواہ مخواہ ترکہ کے لیے ایک محافظ مقرر کر کے اپنے لیے نفع حاصل کرنے کی ایک صورت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

اگر دونوں وصیوں نے ایک نابالغ وارث کے حق میں شہادت دی کہ میت کے مال سے یا مال کے علاوہ کسی اور چیز سے اس قدر حصہ اس نابالغ کے لیے ہے تو ان کی شہادت باطل ہوگی۔ کیونکہ یہ دونوں چاہتے ہیں کہ مال مشہود بہ میں اپنے تصرف کی ولایت ثابت کریں۔

مسئلہ:۔ امام محمدؒ نے فرمایا۔ اگر دونوں وصی کسی بالغ وارث کے لیے میت کے مال سے کسی چیز کی شہادت دیں تو جائز نہ ہوگی۔ اگر میت کے مال کے علاوہ کسی دوسری چیز میں ہو تو جائز ہوگی۔ یہ امام ابو حنیفہؒ کی رائے ہے۔ صاحبینؒ نے فرمایا کہ بالغ وارث کے سلسلے [illegible]

صورتوں میں شہادت جائز ہوگی۔ کیونکہ وارث جب بالغ ہوں تو ان دونوں کے ترکہ میں ولایت تصرف ثابت نہ ہوگی۔ اور شہادت شبۂ الزام سے خالی ہوگی۔

امامؒ فرماتے ہیں کہ ان کے لیے ولایت حفظ اور وارث کے غیر موجود ہونے پر بیع منقول کی ولایت ثابت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا الزام کے تحقق کا امکان موجود ہے۔ بخلاف اس صورت کے جبکہ ترکہ کے علاوہ کسی اور چیز کی شہادت دیں کیونکہ باپ کے وصی کی ولایت غیر ترکہ میں منقطع ہوتی ہے اس لیے کہ میت نے وصی کو اپنے ترکہ میں قائم مقام مقرر کیا ہے نہ کہ غیر ترکہ میں۔

مسئلہ: امام محمدؒ نے فرمایا۔ اگر دو شخصوں نے دوسرے دو شخصوں کے لیے گواہی دی کہ ان کا میت پر ہزار درہم قرض ہے اور ان دونوں آخری شخصوں نے پہلے دو کے لیے ایسی ہی گواہی دی تو ان کی شہادت جائز ہوگی اگر ہر فریق دوسرے کے لیے ہزار درہم کی وصیت کی گواہی دے تو جائز نہ ہوگی۔ یہ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کا قول ہے۔ امام ابو یوسفؒ نے کہا کہ قرض کے سلسلے میں بھی قبول نہیں کی جائے گی۔ امام خصافؒ کی روایت کے مطابق امامؒ کا قول امام ابو یوسفؒ کے ساتھ ہے۔ اور امام ابو یوسفؒ سے امام محمدؒ کے قول کی طرح بھی مروی ہے۔

قبولیت شہادت کے قول کی وجہ یہ ہے کہ قرض مقروض کے ذمہ

واجب ہوتا ہے اور ذمہ ایسی چیز ہے جو مختلف حقوق کو قبول کرتا ہے تو شرکت نہ رہی (یعنی ہر فریق کی گواہی صرف دوسرے فریق کے لیے ہوگی دوسرے کے حاصل کردہ مال میں اس کو شرکت کا اختیار نہیں) لہٰذا اگر اجنبی نے احسان سے کام لیتے ہوئے ان دونوں فریقوں میں سے ایک کی طرف سے قرض ادا کردیا تو دوسرے فریق کو مقبوض میں شرکت کا حق نہیں ہوتا۔

شہادت رد کرنے کے قول کی وجہ یہ ہے کہ موت کی وجہ سے قرض کا تعلق ترکہ سے ہوگیا (ذمہ نہ رہا) کیونکہ ذمہ تو موت کی وجہ سے معدوم ہوگیا۔ اسی بناء پر اگر ایک فریق ترکہ سے اپنا حق وصول کرلے تو دوسرے فریق کو اس میں شرکت کا حق ہوگا۔ تو اس صورت میں گواہی گویا حق شرکت ثابت کرنے کے لیے ہوگی۔ اور الزام متحقق ہوجائے گا۔ بخلاف اس صورت کے جب کہ مدیون زندہ ہو (کہ اس صورت میں) ایک فریق کے لیے قرض کی ادائیگی دوسرے کے لیے شرکت کا سبب نہیں ہوتی) کیونکہ وہ واجب فی الذمہ ہے اس لیے کہ ذمہ باقی ہے۔ مال سے متعلق نہیں پس شرکت متحقق نہ ہوگی۔

مسئلہ: امام محمدؒ نے فرمایا۔ اگر دو شخص یہ گواہی دیں کہ موصی نے اپنی باندی کی ان دو شخصوں کے لیے وصیت کی ہے۔ اور یہ دو شخص پہلے دو گواہوں کے لیے یہ شہادت دیں کہ موصی نے ان کے لیے ایک غلام کی وصیت کی ہے تو بالاتفاق شہادت جائز ہوگی کیونکہ اس میں کسی فریق

کے لیے کوئی شرکت نہیں۔ اور الزام کا امکان بھی نہیں ہے۔

اگر دونوں یہ گواہی دیں کہ موصی نے ان دو شخصوں کے لیے تہائی مال
کی وصیت کی ہے اور مشہود لہما گواہی دیں کہ موصی نے ان گواہوں کے لیے
تہائی مال کی وصیت کی ہے تو شہادت باطل ہوگی۔ اور یہی حکم ہے
جب کہ پہلے گواہ یہ گواہی دیں کہ میت نے ان دو شخصوں کے غلام کی
وصیت کی ہے اور مشہود لہما نے شہادت دی کہ موصی نے ان گواہوں کے
لیے تہائی مال کی وصیت کی ہے۔ تو یہ شہادت باطل ہوگی۔ کیونکہ دونوں
صورتوں میں شہادت شرکت ثابت کرنے والی ہے۔ اس لیے قابلِ
قبول نہ ہوگی۔

كِتَابُ الْخُنْثٰى فَصْلٌ فِيْ بَيَانِهٖ
کتاب المخنث مخنث کی ماہیت اور اس کے اقسام کا بیان

(مخنث سے مراد وہ ہے جس کے پیدائشی طور پر مردانہ اور زنانہ آلات موجود ہوں۔ اس سے وہ لوگ مراد نہیں کہ جو اپنا آلۂ تناسل کاٹ کر عورتوں جیسی صورت اختیار کریں)

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا جب نومولود بچے کا فرج اور آلۂ تناسل دونوں ہوں تو وہ خنثیٰ کہلاتا ہے۔ اگر وہ آلۂ تناسل کے ذریعے پیشاب کرے تو لڑکا ہے اور اگر فرج کے ذریعے پیشاب کرے تو لڑکی ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا تھا کہ اسے کس حیثیت سے وارث بنایا جائے۔ فرمایا اس کو پیشاب کرنے کی حیثیت سے وارث بنایا جائے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح منقول ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو عضو پیشاب کا مخرج ہے وہ اس امر کی دلالت ہے، کہ وہی عضو صحیح واصلی ہے اور دوسرا بمنزلہ عیب کے ہے۔

اگر بچہ دونوں سوراخوں سے پیشاب کرے تو جس سوراخ سے پیشاب پہلے نکلتا ہے اسی پر حکم عائد کیا جائے گا کیونکہ یہ اس بات کی دوسری دلیل ہے کہ وہی اصلی عضو ہے۔

اگر پیشاب نکلنے میں دونوں سوراخ برابر ہوں تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مقدار کی کثرت کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔ صاحبینؒ فرماتے ہیں کہ جس عضو سے زیادہ پیشاب نکلتا ہے اسی کی طرف نسبت کی جائے گی۔ کیونکہ یہ اس عضو کی قوت کی دلیل ہے۔ اور اس امر کی علامت بھی ہے کہ وہی اصلی عضو ہے۔ اس لیے کہ شریعت میں اکثر کو کل کا حکم دیا جاتا ہے لہذا کثرت کی بناء پر ترجیح دی جائے گی۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ پیشاب کا کثرت سے نکلنا قوت کی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ اس کثرت کا سبب بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ایک عضو کے سوراخ میں کشادگی ہوتی ہے اور دوسرے عضو کے سوراخ میں تنگی۔

اگر دونوں سوراخوں سے برابر برابر پیشاب نکلتا ہے تو اسے بالاتفاق خنثیٰ مشکل کہا جاتا ہے کیونکہ کوئی وجہ ترجیح موجود نہیں۔

مسئلہ:۔ امام قدوریؒ نے فرمایا۔ جب خنثیٰ بالغ ہو گیا اور اس کی ڈاڑھی نکل آئی یا وہ عورتوں کی مباشرت پر قادر ہو گیا تو وہ مرد ہوگا۔ اسی طرح جب اسے مردوں کی طرح احتلام کا عارضہ پیش آئے یا اس کی چھاتیاں برابر رہیں جیسے کہ مردوں کی چھاتیاں اور سینہ برابر ہوتا

ہے تو مرد شمار ہوگا۔ کیونکہ یہ مذکورہ تمام علامات مردوں کی ہیں۔

مسئلہ:۔ اگر اس کے پستان عورتوں کی طرح ظاہر ہو گئے یا اس کی چھاتیوں میں دودھ اتر آیا یا اسے حیض آگیا۔ یا حمل قرار پا گیا۔ یا اس کے فرج تک جماع کے لیے رسائی ممکن ہے تو وہ عورت ہوگا۔ کیونکہ یہ مذکورہ امور عورتوں کی علامتیں ہیں۔

اگر بلوغ کے بعد ان علامات میں سے کوئی علامت بھی ظاہر نہ ہو تو وہ خنثیٰ مشکل ہوگا۔ اسی طرح اگر ان علامات میں باہمی تعارض پیدا ہو جائے یعنی بعض علامات مردوں کی نمودار ہوں اور بعض عورتوں کی۔ تو بھی اسے خنثیٰ مشکل قرار دیا جائے گا۔

فَصْلٌ فِیْ اَحْکَامِہٖ

خنثیٰ مشکل کے احکام کا بیان

خنثیٰ مشکل کے بارے میں اصول یہ ہے کہ امورِ شرعیہ کے سلسلے میں وہ چیز اختیار کی جائے جو اس کے حق میں زیادہ احتیاط و اعتماد والی ہو اور کسی ایسے حکم کے ثابت ہونے کا حکم نہ دیا جائے جس کے ثبوت میں شک ہو (مثلاً حکم میراث وغیرہ کہ اسے شک کے ہوتے ہوئے مذکر کا حکم نہیں دیا جائے گا)

مسئلہ:۔ امام قدوری نے فرمایا۔ خنثیٰ مشکل جب امام کی اقتدا کرے تو عورتوں اور مردوں کی صف کے درمیان کھڑا ہو۔ ممکن ہے کہ وہ عورت ہو تو اسے مردوں کے ساتھ مل کر کھڑا نہیں ہونا چاہیے تاکہ مردوں کی نماز فاسد نہ کرے اور نہ عورتوں کے درمیان کھڑا ہو اس احتمال کی بنا پر کہ شاید وہ مرد ہو اور اپنی نماز فاسد نہ کرے۔

اگر وہ عورتوں کی صف میں کھڑا ہو جائے تو مناسب یہ ہے کہ

وہ اپنی نماز کا اعادہ کرے اس کے مرد ہونے کے احتمال کی بنا پر۔ اگر وہ مردوں کی صف میں کھڑا ہو تو اس کی نماز مکمل ہو گی۔ لیکن اس کے دائیں بائیں اور اس کے پیچھے اس کی محاذات میں کھڑے ہونے والے نمازی احتیاطاً اپنی نماز کا اعادہ کریں۔ کیونکہ اس کے عورت ہونے کا احتمال ہے۔

مسئلہ: فرمایا ہمارے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ وہ دوپٹہ اوڑھ کر نماز پڑھے اس احتمال کی بنا پر کہ وہ عورت ہو اور اپنی نماز میں عورتوں کے جلوس کی طرح جلوس کرے۔ کیونکہ اگر وہ حقیقۃً مرد ہے تو صرف سنت کا ترک کرنے والا ہوگا اور ایسا ترک فی الجملہ جائز ہے۔ (غور وغیرہ کی صورت میں) اگر وہ درحقیقت عورت ہے تو مردوں کی طرح جلوس کرنے سے ایک امر مکروہ کا مرتکب ہوگا۔ کیونکہ جہاں تک ممکن ہو عورت سے پردہ پوشی واجب ہے۔

امام قدوریؒ فرماتے ہیں کہ اگر وہ دوپٹے کے بغیر نماز پڑھے تو میں اسے نماز کے اعادہ کا حکم دوں گا۔ یہ احتمال ہے کہ وہ عورت ہو اس لیے اعادے کا حکم استحباب کے درجہ میں ہوگا۔ اگر وہ نماز کا اعادہ نہ کرے تو بھی اس کے لیے کافی ہوگی۔

مسئلہ:۔ اگر خنثیٰ مشکل کے پاس مال ہو تو اس کے لیے ایک باندی خریدی جائے گی تاکہ اس کا ختنہ کرے۔ کیونکہ اس کی باندی کو اس کی شرمگاہ کی طرف دیکھنا مباح ہے خواہ خنثیٰ مرد ہو یا عورت۔ کسی مرد سے ختنہ کرانا مکروہ ہے۔ ممکن ہے کہ وہ مؤنث ہے۔ اسی طرح عورت

سے ختنہ کرانا بھی مکروہ ہے کیونکہ شائد وہ مرد ہو۔ تو احتیاط اسی صورت میں ہے جو ہم نے بیان کی (کہ باندی خریدی جائے جو اس کا ختنہ کرے)۔

اگر اس کے پاس ذاتی مال نہ ہو تو امام اس کے لیے بیت المال کی رقم سے باندی خریدے۔ کیونکہ بیت المال کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی ضروریات کی کفالت کی جائے۔ جب بیت المال سے خرید کردہ باندی ختنہ کے فریضہ سے فارغ ہو جائے تو باندی کو فروخت کر کے اس کی قیمت بیت المال میں واپس جمع کرادی جائے کیونکہ اب باندی کی کوئی ضرورت باقی نہیں۔

مسئلہ:۔ خنثیٰ مشکل کے لیے اپنی زندگی میں زیورات اور ریشم کا استعمال مکروہ ہے۔ اسی طرح مردوں اور عورتوں کے سامنے بے پردہ آنا بھی مکروہ ہے۔ یا یہ کہ کوئی غیر محرم مرد یا عورت خلوت میں اس کے پاس بیٹھے۔ نیز اس کے لیے غیر محرم کے علاوہ دوسرے مردوں کے ساتھ سفر کرنا بھی مکروہ ہے تاکہ فعل حرام سے اجتناب کیا جا سکے۔

مسئلہ:۔ اگر اس نے احرام باندھا درآنحالیکہ وہ قریب البلوغ ہے امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ میں اس کے لباس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ اگر وہ مذکر ہے تو اس کے لیے سلا ہوا کپڑا استعمال کرنا مکروہ ہے اور اگر وہ مؤنث ہے تو اس کے لیے سلے ہوئے کپڑے کا استعمال ترک کرنا مکروہ ہے۔

امام محمدؒ نے فرمایا کہ وہ عورتوں والا لباس پہنے کیونکہ سلا ہوا لباس

ترک کرنا ذرا نہ تھا بلکہ وہ عورت ہے زائد تحش اور بے پردگی کی چیز ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ مرد ہو دنے کی حالت میں سلا ہوا پہنے (یعنی اگر وہ مرد ہو تو اس کے لیے سلا ہوا کپڑا استعمال کرنا اتنا معیوب نہیں جیب کہ وہ عورت ہو اور آن سلا کپڑا پہنے) اور اس پر کوئی کفارہ وغیرہ لازم نہ ہوگا کیونکہ وہ بالغ نہیں بلکہ قریب البلوغ ہے۔

مسئلہ:۔ اگر ایک شخص نے طلاق یا عتاق کے ساتھ قسم کھاتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا کہ جو پہلا بچہ تو جنے اگر وہ لڑکا ہو تو تجھے طلاق ہے یا میرا غلام آزاد ہے۔ لیکن عورت نے ایک خنثیٰ کو جنم دیا۔ تو طلاق یا عتاق اس وقت تک واقع نہ ہوگا جب تک کہ خنثیٰ کا معاملہ ظاہر نہ ہو جائے کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ کیونکہ شک کے ہوتے ہوئے قسم میں حانث ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

اگر اس نے کہا کہ جو بھی میرا غلام ہے وہ آزاد ہے۔ یا کہا کہ جو بھی میری باندی ہے وہ آزاد ہے حالانکہ اس کی ملکیت میں صرف خنثیٰ مملوک ہے تو وہ اس وقت تک آزاد نہ ہوگا جب تک کہ اس کا معاملہ ظاہر نہ ہو جائے۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔

اگر اس نے دونوں باتیں کہیں (یعنی میرا ہر غلام یا میری ہر باندی) تو یہ خنثیٰ مملوک آزاد ہو جائے گا۔ کیونکہ دو وصفوں سے ایک تو یقینی ہے۔ اس لیے کہ خنثیٰ ان دو میں سے ایک سے خالی نہیں۔ اگر اس نے کہا کہ میں مرد ہوں یا کہا کہ میں عورت ہوں تو اس کا قول نہیں کیا جائے گا۔

جب کہ وہ خنثیٰ مشکل ہو۔ کیونکہ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جو مقصود دلیل کے خلاف ہے۔ اگر وہ خنثیٰ مشکل ہو تو پھر اس کا قول قبول کیا جانا ہی مناسب ہے۔

مسئلہ۔ اگر خنثیٰ حقیقت حال کے ظہور سے پہلے ہی وفات پا گیا تو اسے نہ تو مرد غسل دے گا اور نہ عورت دے گی۔ کیونکہ مردوں اور عورتوں کو باہمی طور پر ایک دوسرے کو غسل دینے کی حلت ثابت نہیں لہٰذا احتمالِ حرمت کے مدنظر اس سے اجتناب کیا جائے گا اور میت کو مٹی سے تیمم کرایا جائے گا کیونکہ شرعی طور پر غسل متعذر ہے۔

اگر خنثیٰ قریب البلوغ ہو تو وہ کسی میت کو غسل دینے کے لیے حاضر نہ ہو خواہ میت مرد ہو یا عورت اس احتمال کی بنا پر کہ شاید وہ مرد ہو یا عورت ہو۔

اور مناسب یہ ہے کہ اس کے دفن کے وقت قبر پر پردہ کیا جائے (جیسا کہ عورت کے دفن کے وقت ہوتا ہے) کیونکہ اگر وہ درحقیقت عورت ہے تو ہم ایک امر واجب کو قائم کر رہے ہیں اور اگر مرد ہو تو پھر بھی پردہ کرنے میں کسی قسم کی مضرت نہیں۔

اگر خنثیٰ مشکل مر گیا اور اس پر اور ایک مرد اور ایک عورت پر نمازِ جنازہ پڑھی گئی (یعنی تینوں جنازوں پر یکبارگی نمازِ جنازہ پڑھی گئی) تو امام کے سامنے پہلے مرد کا جنازہ رکھا جائے اس کے بعد خنثیٰ کا جنازہ اور اس کے بعد عورت کا جنازہ رکھا جائے۔ مرد کے پیچھے اس کا جنازہ

اس لیے رکھا گیا کہ شاید وہ عورت ہو اور عورت کے جنازے پر اس لیے مقدم کیا گیا کہ شاید وہ مرد ہو۔

اگر کسی مجبوری کی بناء پر ایک مرد اور خنثیٰ کو اکٹھا دفن کرنا پڑا تو خنثیٰ کو مرد کے پیچھے رکھا جائے گا (یعنی مرد قبلہ کی طرف ہوگا اور پیچھے خنثیٰ) کیونکہ اس امر کا احتمال ہے کہ شاید وہ عورت ہو۔ اور ان کے درمیان تودۂ خاک سے آڑ بنادی جائے گی۔ اگر خنثیٰ کو مجبوراً ایک عورت کے ساتھ ایک ہی قبر میں دفن کرنا پڑے تو قبلہ کی طرف خنثیٰ مقدم کیا جائے گا اس احتمال کی بناء پر کہ شاید وہ مرد ہو۔

اگر خنثیٰ مشکل کی چارپائی پر عورتوں کے مانند نعش ڈالی جائے تو یہ مجھے زیادہ پسند ہے۔ شاید کہ وہ درحقیقت عورت ہو (عورت کی چارپائی پر عموماً کوئی محرابی چیز رکھ کر اوپر کپڑا ڈالا جاتا ہے تاکہ اس کے اعضاء کا ابھار نظر نہ آئے۔ اسے نعش کہا جاتا ہے)۔

اور اسے اس طرح کفن دیا جائے جیسا کہ لڑکیوں کو دیا جاتا ہے یہی امر میرے نزدیک پسندیدہ ہے۔ یعنی اسے پانچ کپڑوں میں کفن دیا جائے۔ کیونکہ اگر وہ عورت ہی ہو تو سنت کا قیام عمل میں لایا گیا اور اگر وہ مرد ہو تو تین کپڑوں پر صرف دو کا اضافہ ہوا اور اس میں کوئی حرج نہیں۔

اگر خنثیٰ کا باپ وفات پا گیا اور اس کے علاوہ ایک اور بیٹا وارث چھوڑا تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک میراث کے تین حصے کیے جائیں گے۔ دو حصے بیٹے کے اور ایک حصہ خنثیٰ کا ہوگا۔ کیونکہ

میراث کے معاملے میں امامؒ خنثیٰ مشکل کو مؤنث تصور فرماتے ہیں۔ ہاں اگر اس کے سوا کوئی دوسرا امر ظاہر ہو کہ علامات مذکر کا پتہ چل جائے تو اسے مرد شمار کیا جائے گا۔

صاحبینؒ نے فرمایا کہ اُسے مذکر کی نصف میراث اور مؤنث کی نصف میراث ملے گی۔ امام شعبیؒ کا بھی یہی قول ہے۔ فقہاء نے امام شعبی کے قول کے قیاس میں اختلاف کیا ہے۔

امام محمدؒ نے فرمایا کہ ان کے درمیان مال کو بارہ حصوں میں تقسیم کیا جائے گا بیٹے کو سات حصے ملیں گے اور خنثیٰ کو پانچ حصے۔

امام ابو یوسفؒ نے فرمایا مال سات حصوں میں منقسم ہوگا چار لڑکے کو اور تین خنثیٰ کو۔ کیونکہ اگر بیٹا تنہا ہی وارث ہو تو وہ ساری میراث کا مستحق ہوتا ہے اور خنثیٰ تین چوتھائی کا۔ اور دونوں کے جمع ہونے کی صورت میں مال کو دونوں کے حق کی مقدار پر تقسیم کیا جائے گا یعنی خنثیٰ کے تین کے حساب سے اور بیٹے کے چار کے حساب سے۔ اس طرح کل سات حصے ہوں گے (جن میں بیٹے کے لیے چار اور خنثیٰ کے تین ہوں گے)

امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اگر خنثیٰ ابھی مرد ہوتا تو مال دونوں کے درمیان نصف نصف ہوتا۔ اور اگر خنثیٰ عورت ہوتی تو مال ان دونوں میں تین تہائی کے حساب سے تقسیم ہوتا (بیٹے کی دو تہائیاں اور خنثیٰ کی ایک) لہٰذا ہم کو ایسے حساب اور عدد کی ضرورت پڑی جس کا حساب نصف اور تہائی پر سیدھا رہتا ہو ایسے عدد کا کم سے کم درجہ چھ ہے تو ایک

حال میں (یعنی خنثیٰ کے مذکر ہونے کی صورت میں) مال ان دونوں میں نصف نصف ہوگا اور ہر ایک کو تین تین حصے ملیں گے۔ اور ایک حال میں (جب کہ وہ مؤنث ہو) خنثیٰ کے لیے دو حصے اور لڑکے کے لیے چار حصے ہوں گے۔ اس لحاظ سے خنثیٰ کے دو حصے تو یقینی ہو گئے اور تیسرے زائد حصے میں جو لڑکا ہونے کی صورت میں ملتا شک پڑ گیا۔ لہٰذا اس زائد حصے کو نصف نصف کر لیا جائے گا اور خنثیٰ کے لیے اڑھائی حصے ہو جائیں گے۔ لیکن اس طرح حصوں میں کسر واقع ہو جاتی ہے۔ تو ہم نے اصل مخرج یعنی چھ کو دگنا کر دیا تاکہ کسر جاتی رہے۔ لہٰذا تقسیم بارہ حصوں کے لحاظ سے کی گئی۔ کہ خنثیٰ کو پانچ حصے اور بیٹے کو سات حصے ملیں گے۔

امام ابوحنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ یہاں ابتداءً سے مال ثابت کرنے کی حاجت ہے۔ اور لڑکی کی میراث جو کہ کم تر ہے یقینی طور پر ثابت ہے اور اس سے زائد میں شک ہے تو ہم نے یقینی امر کو ثابت کر دیا بایں طور کہ اسی پر حصۂ میراث کو مقصور رکھا۔ کیونکہ شک کی وجہ سے مال ثابت نہیں ہوا کرتا اور یہ صورت ایسے ہی ہوگی جیسے کہ کسی اور سبب کی وجہ سے مال کے وجوب میں شک پیدا ہو جائے تو اس صورت میں یقینی صورت کو اختیار کیا جاتا ہے لہٰذا یہاں بھی اسی قسم کی یقینی صورت اختیار کی جائے گی۔ لیکن اگر صورت ایسی ہو کہ اگر ہم خنثیٰ کو لڑکا تصور کریں تو اس تو اس کو جس قدر حصہ ملتا ہے وہ (اس کے حق سے) کمتر ہے۔ تو ایسی صورت میں اسے لڑکے کا حصہ دیا جائے گا کیونکہ اب یہی یقینی ہے

اس کی صورت یہ ہے کہ میت عورت نے ورثار میں اپنا خاوند۔ ماں۔
ایک سگی بہن جو ماں باپ دونوں کی طرف سے ہے اور یہ بہن خنثیٰ ہے،
چھوڑی۔ یا دوسری صورت یہ کہ میت مرد نے اپنے ورثار میں ایک بیوی
چھوڑی اور دو ماں شریک بھائی۔ اور ایک سگی بہن جو ماں باپ کی طرف
سے ہے اور یہی بہن خنثیٰ ہے (ان دونوں صورتوں میں خنثیٰ کو کمتر حصہ
ملتا ہے) ہمارے نزدیک پہلی صورت میں شوہر کو نصف اور ماں کو
تہائی دے کر باقی خنثیٰ بہن کو دیا جائے گا اور دوسری صورت میں عورت
کے لیے چوتھائی۔ ماں شریک بھائیوں کو تہائی اور باقی خنثیٰ بہن کو
ملتا ہے۔ کیونکہ یہی حصہ دونوں حصوں میں کمتر ہے (حالانکہ اگر اسے
لڑکی شمار کیا جاتا تو اس کے لیے نصف حصہ ہوتا۔ دونوں صورتوں میں
اس کو نصف سے کم ملا۔ اور یہی لڑکے کو ملتا کیونکہ وہ عصبہ ہوتا ہے
اور اہل فرائض کے بعد جو باقی بچے وہ لیتا ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ خنثیٰ
اگر بیٹے کے ساتھ ہو تو اسے دختر والا حصہ ملتا ہے۔ اور اگر ایسے ورثار
کے ساتھ ہو کہ اسے دختر شمار کرنے میں زیادہ ملتا ہے اور لڑکا فرض کرنے
میں کم۔ تو لڑکا شمار کرکے کم تر حصہ دیا جائے گا کیونکہ اصول یہی ہے
کہ کم تر حصہ یقینی ہوتا ہے۔ عین الہدایہ)

وَاللّٰہُ تَعَالیٰ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

مَسَائِلُ شَتّٰی

متفرق مسائل

مسئلہ: امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا۔ اگر کسی گونگے کو اس کی وصیت کی تحریر پڑھ کر سنائی گئی۔ پھر اسے کہا گیا کہ کیا ہم اس چیز کی جو تحریر میں مندرج ہے تجھ پر گواہی دیں پس اس نے سر سے اشارہ کیا یعنی ہاں کی۔ یا اس نے لکھ دیا "ہاں" جب گونگے شخص کی طرف سے اس قسم کی چیز پائی جائے جس سے متعارف ہو کہ یہ اقرار ہے تو جائز ہوگا اور جس شخص کی زبان میں بندش پیدا ہو جائے اس کے حق میں یہ بات جائز نہ ہوگی (یعنی صرف سر سے اشارہ کافی نہ ہوگا۔ جب تک وہ اشارے کی بناء پر سمجھانے میں معروف نہ ہو جائے)

امام شافعیؒ نے فرمایا کہ دونوں صورتوں میں معروف اشارے پر اعتبار کرنا جائز ہے۔ کیونکہ یہ جواز تکلم سے عاجزی کی بناء پر ہے۔ اور یہ عجز دونوں صورتوں میں پایا جاتا ہے۔ عارضی اور اصلی عجز میں

کوئی فرق نہیں (عارضی جیسے وہ شخص جس کی زبان بند ہو جائے - اصلی عجز جیسے گونگے کی صورت میں) جیسا کہ ذکاۃ اضطراری کے سلسلے میں اصلی وحشی شکار اور پالتو جانور وحشی بن جانے والا برابر ہوتے ہیں (اسی طرح اصلی اور عارضی عجز بھی برابر ہوگا)

ہمارے علماء کے نزدیک گونگے اور زبان کی بندش والے کے درمیان فرق یہ ہے کہ اشارہ اسی وقت قابل اعتبار ہوتا ہے جب کہ وہ اشارہ معہود و معروف ہو (یعنی مدت دراز سے خویش و اقارب اور دوستوں کو یہ تجربہ ہو جائے کہ جب وہ اس قسم کا اشارہ کرتا ہے تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے) اور یہ تجربہ گونگے کے حق میں تو ثابت و موجود ہے - لیکن وہ شخص جس کی زبان میں بندش پیدا ہو جائے اس میں یہ بات موجود نہیں - اگر بندشِ زبان کا یہ عارضہ طویل ہو جائے اور اس کے اشارات معہود و متعارف ہو جائیں - تو فقہاء کے نزدیک یہ اشارات بھی گونگے کے اشاروں کی طرح ہوں گے -

دوسری بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں جو کوتاہی پیش آئی ہے وہ اسی کی طرف سے ہے - کیونکہ اس نے وصیت کو اس حد تک مؤخر کر دیا ہے (حتیٰ کہ بندشِ زبان کا عارضہ پیش آگیا) لیکن گونگے کی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں پائی گئی - تیسری بات یہ ہے کہ عارضی چیز تو زوال کے کنارے پر ہوتی ہے (ممکن ہے کہ جلد ہی یہ عارضہ زائل ہو جائے) لیکن اصلی عذر کی یہ کیفیت نہیں ہوتی (کیونکہ وہ تو دائمی ہوتا ہے)

لہٰذا ایک صورت کو دوسری پر قیاس نہیں کیا جائے گا) پالتو جانور کے سلسلے میں جو کہ وحشی بن جائے ذکاۃِ اضطراری کے جواز کو ہم نے نص سے معلوم کیا ہے۔

مسئلہ: امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا۔ جب گونگا کچھ لکھ لے یا معہود قسم کا اشارہ کر سکتا ہے تو اس کا نکاح کرنا۔ طلاق دینا۔ آزاد کرنا۔ خریدنا اور فروخت کرنا جائز ہوگا اور اس کے لیے قصاص لیا جائے گا اور اس سے بھی قصاص لیا جائے گا (یعنی گونگا اگر تحریر یا اشارے سے کسی پر قتل کا دعویٰ کرے تو ثابت ہونے پر قاتل سے قصاص لیا جائے گا۔ یا خود کسی کو قتل کرنے کا اقرار کرے تو اس سے قصاص لیا جائے گا) لیکن اس پر حد جاری نہیں کی جائے گی۔ اور نہ اس کی وجہ سے کسی دوسرے پر حد جاری کی جائے گی۔ تحریر کے معتبر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ایسے شخص سے دور سے کتابت کرنا قریب والے آدمی سے خطاب کرنے کی طرح ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کا ہے تو تبلیغ کی ذمہ داری بذریعہ خطاب ادا فرمائی اور کا ہے غیر موجود لوگوں کے لیے اس ذمہ داری کو بذریعہ کتابت پورا فرمایا (کہ آپ نے شاہانِ وقت کو خطوط ارسال فرمائے) غیر موجود لوگوں کے حق میں تحریر کا جواز ضرورت اور مجبوری کے پیش نظر ہوتا ہے اور یہ مجبوری گونگے کے سلسلے میں تو بالکل واضح، ظاہر اور لازم ہے (اسی لیے تحریر کو قابلِ اعتبار تسلیم کیا جاتا ہے)۔

کتابت کے تین درجے ہیں۔ اوّل وہ کتابت جو بالکل ظاہر اور واضح ہو اور جس کی صحت میں کسی قسم کا اشتباہ نہ ہو (الفاظ و حروف صاف صاف لکھے ہوئے ہوں) تو ایسی تحریر غائب و حاضر کے حق میں بمنزلہ نطق خطاب اور گفتگو کے ہے۔ مشائخ کرام نے اسی طرح فرمایا ہے۔

دوم۔ جو واضح ہو لیکن مرسوم نہ ہو (یعنی متعارف طریقے اور رسم الخط کے مطابق نہ ہو یا اس میں یہ نہ لکھا ہو کہ کس کی جانب سے ہے یعنی کاتب کون ہے اور مکتوب الیہ کون ہے) جیسا کہ دیوار پر کتابت کر دے یا درخت کے پتوں وغیرہ پر۔ تو ایسی تحریر کے سلسلے میں کاتب کی نیت کا پتا چلایا جائے گا۔ کیونکہ یہ تحریر بمنزلہ صریح الکنایہ کے ہے۔ لہٰذا اس میں نیت ضروری ہو گی (مثلاً اپنی زوجہ سے کہے اَنْتِ بائنٌ کہ تو جدا ہے اور اس میں یہ وضاحت نہیں کہ علاقۂ نکاح سے جدا ہے یا برائی سے جدا ہے۔ لہٰذا نیت کی ضرورت ہو گی)۔

سوم۔ جو مستبین یعنی واضح اور ظاہر نہ ہو۔ جیسے کہ ہوا میں یا پانی پر کوئی چیز تحریر کرنا۔ اس کی حیثیت اس کلام کی سی ہے جو غیر مسموع ہے یعنی جو مخاطب کو سنائی ہی نہ دے۔ لہٰذا ایسی تحریر سے کوئی حکم ثابت نہ ہو گا۔

اشارۂ معہودہ کو گونگے شخص کے حق میں ان مذکورہ احکام (نکاح و طلاق وغیرہ) کے سلسلے میں اس لیے حجت قرار دیا گیا کہ اس کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ کیونکہ یہ مذکورہ امور حقوق العباد سے تعلق رکھتے

ہیں (اس لیے کہ نکاح - طلاق - اور خرید و فروخت وغیرہ کی انسانوں کو ضرورت پیش آتی رہتی ہے اور وہ ان کی انجام دہی میں مجبور ہوتے ہیں) اور ان احکام کو چند مخصوص الفاظ سے اختصاص بھی نہیں کہ فلاں چند الفاظ سے تو صحیح ہوں اور فلاں الفاظ سے صحیح نہ ہوں - بلکہ بعض احکام تو الفاظ کے بغیر بھی ثابت ہو جاتے ہیں - اور قصاص بھی چونکہ حقوق العباد سے تعلق رکھتا ہے (لہٰذا اس میں بھی تحریر قابل اعتبار ہے - البتہ حدود کے بارے میں تحریر معتبر نہ ہوگی - کیونکہ حد کا تعلق حقوق اللہ سے ہے - اور حدود شبہ سے ساقط ہو جایا کرتی ہیں (گونگے کا اشارہ چونکہ صریح نہیں ہوتا - اس لیے اس میں شبہ کا احتمال رہتا ہے اور شبہ کے ہوتے ہوئے حد کا نفاذ نہیں ہو سکتا - چنانچہ گونگے پر حد قذف جاری نہ ہوگی اگر اس پر کوئی شخص الزام دھرے - اسی طرح اگر گونگا کسی شخص پر افتراء باندھے تو اس پر بھی حد قذف نافذ نہ ہوگی) کیونکہ ممکن ہے کہ وہ اپنے اشارے سے قاذف کی تصدیق کر رہا ہو (حد کا مطالبہ نہ کر رہا ہو) تو اس شبہ کی بناء پر قاذف پر حد جاری نہیں کی جائے گی اور گونگے کو بھی اشارے سے قذف کرنے کی وجہ سے حد نہیں لگائی جائے گی - کیونکہ صراحۃً تہمت لگانے کی صورت موجود نہیں - حالانکہ قذف میں شرط یہ ہے کہ صریح الفاظ کے ساتھ بہتان لگایا جائے -

حد و قصاص میں فرق یہ ہے کہ حد ایسے بیان سے ثابت نہیں ہوتی جس میں کسی قسم کا شبہ ہو (تو اشارے وغیرہ سے کیسے ثابت ہوگی) کیا

آپ کو معلوم نہیں کہ اگر زنا، کے بنا پر کسی شخص کے خلاف حرام وطی کی شہادت دیں یا وہ خود حرام وطی کا اقرار کرے تو حد واجب نہیں ہوتی (جب تک کہ زنا کے صریح الفاظ نہ بولے جائیں) لیکن اگر گواہ قتل مطلق کی گواہی دیں (قتل عمد کے الفاظ استعمال نہ کریں) یا قاتل خود مطلق قتل کا اقرار کرے تو قصاص واجب ہو جاتا ہے اگرچہ عمداً قتل کے الفاظ استعمال نہ کیے جائیں۔

قصاص اور حد میں اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ قصاص میں عوض ہونے کے معنی پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ قصاص مقتول کے نقصان کی تلافی کے لیے مشروع ہوا ہے اس لیے شبہ کے باوجود اس کا ثابت ہونا ممکن ہے جیسے کہ دیگر معاوضات جن میں بندے کا حق ہوتا ہے شبہ سے ثابت ہو جاتے ہیں لیکن وہ حدود جو کہ خالصتہً حقوق اللہ سے تعلق رکھتی ہیں ان کی مشروعیت زجر و تنبیہ کی بناء پر ہے اور ان میں عوض ہونے کے معنی نہیں پائے جاتے۔ لہٰذا ایسی حدود شبہ کی بناء پر ثابت نہ ہوں گی۔ کیونکہ انھیں شبہ کے ہوتے ہوئے ثابت کرنے کی کوئی مجبوری نہیں۔

مبسوط کی کتاب الاقرار میں مذکور ہے کہ غائب کی طرف لکھی ہوئی تحریر ایسے قصاص کے بارے میں جو اس پر واجب ہے حجت نہیں ہے (اور گونگے کا اشارہ تو تحریر سے درجہ میں کم ہوتا ہے۔ تو یہ قصاص کے بارے میں کیونکر حجت ہوگا) اس کا جواب یہ ہے کہ احتمال ہے کہ مسئلہ کا حکم یہاں بھی ایسا ہی ہو (کہ جس طرح حدود میں اس کا اشارہ یا تحریر معتبر نہیں اسی طرح قصاص کے سلسلے میں بھی اس کی تحریر معتبر نہ ہو)

تو گونگے اور غیر گونگے جو کہ غائب ہوں، کے بارے میں دو روایتیں ہوں گی (یعنی کتاب الاقرار کے مطابق غائب کی تحریر سے قصاص واجب نہیں ہوتا۔ اور یہاں گونگے کی روایت پر قیاس کرتے ہوئے قصاص ہوگا۔ اور اسی طرح گونگے کے حق میں تحریر کی بناء پر قصاص ہوگا اور غائب پر قیاس کر کے نہ ہوگا۔ یہ دو روایتیں ہوگئیں) اور یہ احتمال بھی ہے کہ گونگے کا معاملہ غائب کے معاملے سے الگ ہو کیونکہ غائب شخص میں چونکہ نطق و تکلم کی اہلیت موجود ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ ممکن ہے کہ غائب شخص کے صریح بیان تک رسائی حاصل ہو سکے۔ لیکن گونگے کا معاملہ اس کے برعکس ہے کیونکہ اس میں جو آفت گویائی سے مانع ہے اس کی وجہ سے نطق و گویائی تک رسائی ممکن ہی نہیں (اس لیے گونگے کی تحریر اور اشارے کو حجت قرار دیا گیا اور غائب میں چونکہ قوت تکلم موجود ہے لہٰذا اس کی تحریر کو حجت کا درجہ نہ دیا گیا)

واضح ہو کہ گونگے کا مسئلہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ گونگے کا اشارہ مطلقاً معتبر ہے اگر چہ اسے تحریر پر بھی قدرت حاصل ہو۔

اور وہ بات درست نہیں جس کا ہمارے بعض اصحاب کو وہم ہوا ہے۔ کہ گونگے کا اشارہ کتابت پر قدرت ہونے کی بناء پر معتبر قرار نہیں دیا جاتا۔ کیونکہ اشارہ حجت ضروریہ ہے اور قدرت علی الکتابت کے ہوتے ہوئے اشارے کی ضرورت نہیں ہوتی (صاحب ہدایہ فرماتے ہیں کہ یہ وہم درست نہیں) کیونکہ امام محمدؒ نے اشارہ و کتابت دونوں کو

مساوی طور پر جمع کر دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ گونگے نے اشارہ کیا یا لکھ دیا
اور یہ دونوں اس لحاظ سے برابر ہیں کہ دونوں حجت ضروریہ ہیں اور
کتابت میں بیان کا ایسا اضافہ پایا جاتا ہے جو اشارے میں نہیں ہوتا
لیکن اشارے میں بھی ایک ایسا زائد امر پایا جاتا ہے جو کتابت میں
نہیں ہوتا۔ کیونکہ اشارہ بہ نسبت نقوش قلم کے تکلم سے قریب تر
ہوتا ہے۔ تو اشارہ و کتابت کو برابر کا درجہ حاصل ہوا۔

اور جو شخص کسی عارضے کی بناء پر ایک یا دو روز چپ رہے اس
کا بھی یہی حکم ہے کہ اس کا اشارہ اور اس کی کتابت معتبر نہ ہوگی۔ اس
دلیل کی بناء پر جو ہم نے اس شخص کے بارے میں بیان کی ہے جس کی زبان
میں بندش پیدا ہو جائے۔ کہ اس کی گویائی کا آلہ درحقیقت قائم و موجود
ہے۔

بعض حضرات نے کہا کہ یہ بات یعنی زبان کا ایک دو روز بند رہنا
معتقل اللسان کی تفسیر ہے

مسئلہ: امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا۔ اگر کچھ بکریاں ذبح
کی ہوئی ہوں اور ان میں کچھ مردار بھی ہوں۔ اگر مذبوحہ بکریوں کی تعداد
زیادہ ہو تو تحری یعنی غور و فکر اور جانچ پڑتال کر کے کھالے اور مردار
تعداد میں کثیر ہوں یا نصف ہوں تو نہ کھایا جائے۔ یہ مسئلہ اس صورت
میں ہے جب کہ حالت اختیاری ہو (اضطراری نہ ہو) حالت اضطراری
میں تو مذکورہ بالا تمام صورتوں میں کھانا جائز ہوگا کیونکہ حالت اضطراری

تو اس جانور کا کھانا بھی جائز ہوتا ہے جس کا مردار ہونا یقینی طور پر معلوم ہو۔ تو اس جانور کا کھانا بدرجۂ اولیٰ جائز ہوگا۔ جس میں ذبح کا احتمال بھی ہو۔ لیکن مناسب یہ ہے کہ حالتِ اضطرار میں مذبوحہ تلاش کرنے کے لیے تحری کرے۔ کیونکہ تحری کرنا ایک ایسا طریقہ ہے جو اسے فی الجملہ مذبوحہ تک پہنچا دے گا لہٰذا بلاوجہ تحری سے اعراض نہ کرے۔

امام شافعیؒ نے فرمایا کہ اگر مذبوحہ بکریوں کی تعداد زیادہ ہو تب بھی حالتِ اختیاری میں ان کا کھانا جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ تحری تو ضرورت ومجبوری کے وقت دلیل کا درجہ رکھتی ہے۔ لہٰذا بلاضرورت اس کا سہارا نہیں لیا جائے گا اور یہاں کوئی ضرورت ومجبوری نہیں کیونکہ یہ اختیار کی حالت ہے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ مذبوحہ کی کثرت کو اباحت کا فائدہ دینے میں ضرورت کے قائم مقام قرار دیا جاتا ہے (کیونکہ جب اکثر مذبوحہ ہوں تو عدمِ اباحت کی صورت میں مال ضائع ہو جائے گا اور مال کا خواہ مخواہ ضائع کرنا اچھی بات نہیں)

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ مسلمانوں کے بازار عموماً حرام مالوں، چوری کے مالوں اور مغصوبہ مالوں سے خالی نہیں رہتے (کوئی نہ کوئی غلط چیز دکانوں پر ضرور پہنچ جاتی ہے) لیکن اس کے باوجود غالب پر اعتماد کرتے ہوئے ان کا کھانا پینا اور لین دین مباح ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حرام اور ممنوع سے قلیل مقدار تو ایسی چیز ہے جس سے اجتناب

ممکن نہیں ہوتا۔ اور نہ ان سے بچا جا سکتا ہے۔ لہٰذا حرج اور دقت سے بچنے کے لیے قلیل کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ قلیل نجاست اور بدن کے ستر سے قلیل حصے کے کھل جانے میں ہوتا ہے (یعنی قلیل مقدار نجاست قابلِ معافی ہے۔ اسی طرح ستر کے قلیل حصے کا کھل جانا بھی قابلِ عفو ہے)۔

بخلاف اس صورت کے جب کہ مذبوحہ اور مردار بکریاں نصف نصف ہوں یا مردار بکریوں کی تعداد زیادہ ہو تو حالتِ اختیاری میں اباحت نہ ہوگی۔ اور ان کا کھانا جائز نہ ہوگا (جبکہ حالتِ اضطراری نہ ہو۔

وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔ إِلَيْهِ الْمَرْجِعُ وَالْمَآبُ

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آج مورخہ ۳۰ / اپریل ۱۹۷۹ء مطابق ۲ جمادی الثانی ۱۳۹۹ھ ترجمہ کا کام تکمیل پذیر ہوا۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ۔

فہرس موضوعات

کتاب المعاقل والوصایا والخنثی من الہدایۃ